إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد پنجم

مشتمل بر مبحث حصۂ عبادات

جس میں پہلے عبادت کا مفہوم بتایا گیا ہے، پھر نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاص،
توکل، صبر اور شکر وغیرہ جانی و مالی و قلبی عبادات کی تشریح، اور ان کے احکام
و مصالح کی توضیح کی گئی ہے

تالیف

سید سلیمان ندوی

باہتمام مسعود علی ندوی

در مطبع معارف اعظم گڈھ مطبوع گردید

طبع اول

۱۳۵۴ھ
۱۹۳۵ء

فہرست مضامین سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد پنجم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دیباچہ ۱–۵		شاقہ عبادت نہیں،		نماز کی دعا،	۶۵
		عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں	۲۶	اس دعائے محمدی کا موازنہ دوسرے	۷۰
عمل صالح	۱–۷	اسلام میں عبادت کا وسیع مفہوم	۲۸	انبیاء کی مخصوص دعاؤں سے،	
		عبادات چہارگانہ اعمال چہارگانہ	۳۶	حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا،	″
ایمان کے بعد عمل صالح کی اہمیت	۱–۶	کا عنوان ہیں،		زبور میں حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا	۷۱
اعمال صالحہ کی قسمیں،	۷	**نماز ۳۸–۱۴۷**		انجیل میں نماز کی دعا،	۷۲
عبادات،	″			نماز کیلئے تعیین اوقات کی ضرورت	۷۴
اخلاق،	″	توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم،	۴۴	نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں	۷۵
معاملات،	″	اسلام میں نماز کا مرتبہ،	۴۶	نماز کے لئے مناسب فطری اوقات	۷۷
		نماز کی حقیقت	۴۸	اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ	۷۹
عبادات ۸–۳۷		نماز کی روحانی غرض و غایت،	۵۰	اسلام میں طریق و اوقات نماز،	۸۰
اسلام اور عبادت،	۸	نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط	۵۳	نمازوں کی پابندی و نگرانی،	۸۱
اسلامی عبادات کی خصوصیات،	۱۰	کی ضرورت،		نماز کے اوقات مقرر ہیں،	۸۲
صرف ایک خدا کی عبادت	۱۴	ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے،	۵۵	وہ اوقات کیا ہیں،	″
خارجی رسوم کا وجود نہیں،	۱۵	نماز متعدد طریق عبادت کا نام ہے	″	**اوقات کی تکمیل**	۸۶–۹۱
درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں،	″	نماز میں نظام وحدت کا اصول،	۵۶		
خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں،	۱۶	نماز میں جسمانی حرکات،	۵۷	نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل	۸۶
مکان کی قید نہیں،	″	ارکان نماز،	۵۸	**ایک نکتہ**	۹۱
انسانی قربانی کی ممانعت،	۱۷	قیام،	۵۹	جمع بین الصلوتین،	۹۱
حیوانی قربانی میں اصلاح،	″	رکوع،	″	اوقات پنجگانہ اور آیت اسرا	۹۲
مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت،	۱۹	سجدہ،	″	دلوک کی تحقیق،	۹۴
تجرد و ترک لذائذ ریاضات [illegible]	۲۰	نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے	۶۴	اوقات نماز کا ایک اور راز،	۹۷

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
اوقات پنجگانہ کی ایک اور آیت،	۹۸	الفت و محبت،	۱۳۴	دو ضرورتمندون مین ترجیح،	۱۷۳
اطراف النہار کی تحقیق،	//	غمخواری،	//	اسلام مین زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ	۱۷۵
ایک اور طریقۂ ثبوت،	۹۹	اجتماعیت،	۱۳۵	مسکینون، فقیرون اور معذورون	۱۷۷
نماز پنجگانہ احادیث و سنت مین،	۱۰۰	کامون کا تنوع،	۱۳۶	کی امداد،	
تہجد اب نفل ہوگئی، لیکن کیون،	۱۰۲	تربیت،	//	غلامی کا انسداد،	//
قبلہ،	۱۰۳	نظم جماعت،	۱۳۷	مسافر،	//
رکعتون کی تعداد،	۱۱۳	مساوات،	//	جماعتی کامون کے اخراجات کی صورت	۱۷۹
نماز کے آداب باطنی،	۱۱۶	مرکزی اطاعت،	۱۳۸	زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات	//
اقامت صلوٰۃ،	//	معیار فضیلت	۱۳۹	تزکیہ نفس،	۱۸۰
قنوت،	//	روزانہ کی مجلس عمومی،	//	باہمی اعانت کی عملی تدبیر،	۱۸۲
خشوع،	۱۱۷	عرب کی روحانی کایا پلٹ،	۱۴۰	دولتمندی کی بیماریون کا علاج،	۱۸۵
تبتل،	//	**زکوٰۃ**		اشتراکیت کا علاج،	۱۹۴
تضرع،	۱۱۸	**۱۴۸ - ۲۰۹**		اقتصادی اور تجارتی فائدے،	۱۹۵
اخلاص،	۱۱۹	زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم،	۱۴۸	فقراء کی اصلاح،	۱۹۷
ذکر	//	زکوٰۃ گذشتہ مذاہب مین،	//	صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ	۲۰۱
فہم و تدبر،	//	اسلام کی اس راہ مین تکمیل،	۱۵۱	ادا کیا جائے،	
نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے	۱۲۵	اسلام مین زکوٰۃ کی اہمیت،	//	صدقہ چھپا کر دیا جائے،	۲۰۳
ستر پوشی،	۱۲۵	زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل،	۱۵۴	بلند ہمتی اور عالی خیالی،	۲۰۴
طہارت،	۱۲۶	زکوٰۃ کی مدت کی تعیین	۱۵۹	فقراء اور مساکین کی اخلاقی اصلاح	۲۰۵
صفائی،	۱۲۷	زکوٰۃ کی مقدار،	۱۶۰	**روزہ**	
پابندی وقت،	۱۲۹	انفاق،	۱۶۱		
صبح خیزی،	//	زکوٰۃ،	//	**۲۱۰ - ۲۴۴**	
خدا کا خوف،	۱۳۰	نکتہ،	۱۶۲	روزہ کا مفہوم،	۲۱۰
ہشیاری،	//	جانورون پر زکوٰۃ،	۱۶۵	روزہ کی ابتدائی تاریخ،	۲۱۰
مسلمان کا امتیازی نشان،	۱۳۱	نصاب مال کی تعیین،	۱۶۶	روزہ کی مذہبی تاریخ،	۲۱۱
جنگ کی تصویر،	۱۳۲	زکوٰۃ کے مصارف اور ان مین	۱۶۹	روزہ کی حقیقت،	۲۱۴
دائمی تنبہ اور بیداری،	۱۳۳	اصلاحات،		رمضان کی ماہیت،	۲۱۶

مضمون	صفحہ
فرضیتِ صیام کا مناسب موقع سنہ ۲ھ ،	۲۱۹
ایامِ روزہ کی تحدید،	۲۲۰
ایک نکتہ،	۲۲۲
روزہ پر اعتراض اور اسکا جواب	۲۲۵
روزہ مین اصلاحات،	۲۲۶
روزہ کے مقاصد،	۲۳۱
حاملِ قرآن کی پیروی،	۲۳۲
شکریہ،	″
تقویٰ،	۲۳۳
حج ۲۴۲—۲۹۸	
مکہ	۲۴۲
بیت اللہ،	۲۴۴
حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی اور اسکے شرائط،	۲۴۶
ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے،	″
اسلام قربانی ہے،	۲۴۸
یہ قربانی کہان ہوئی،	۲۴۹
مکہ اور کعبہ،	۲۵۱
حج ابراہیمی یادگار ہے،	۲۵۵
حج کی حقیقت،	۲۶۰
حج کی اصلاحات،	۲۶۴
حج کے ارکان،	۲۶۹
احرام،	۲۶۹
طواف،	″
حجر اسود کا استلام،	۲۷۰
صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا،	۲۷۱
وقوفِ عرفہ،	۲۷۲
قیام مزدلفہ،	۲۷۳
منیٰ کا قیام،	″
قربانی،	۲۷۴
حلقِ راس،	″
رمیِ جمار،	۲۷۵
ان رسوم کی غایت،	۲۷۶
حج کے آداب،	۲۷۷
حج کی مصلحتین اور حکمتین،	۲۷۸
مرکزیت،	۲۸۱
رزقِ ثمرات،	۲۸۶
قربانی کی اقتصادی حیثیت،	۲۸۷
ابراہیمی دعا کی مقبولیت،	۲۸۸
تجارت،	″
روحانیت،	۲۸۹
تاریخیت،	۲۹۱
خالص روحانیت،	۲۹۲
حجِ مبرور،	۲۹۳
جہاد ۲۹۹—۳۰۹	
لفظِ جہاد کی تشریح،	۲۹۹
جہاد کی قسمین،	۳۰۲
جہادِ اکبر،	″
جہاد بالعلم،	۳۰۳
جہاد بالمال،	۳۰۵
ہر نیک کام جہاد ہے،	۳۰۶
جہاد بالنفس،	۳۰۷
دائمی جہاد،	۳۰۹
عبادات قلبی ۳۱۰—۳۶۷	
تقویٰ،	۳۱۱
اخلاص،	″
توکل،	″
صبر،	″
شکر،	″
تقویٰ ۳۱۱—۳۱۹	
تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے،	۳۱۱
اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتون کے مستحق ہین،	۳۱۳
کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے،	″
اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہین،	۳۱۴
معیت الٰہی سے سرفراز ہین،	″
قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے،	۳۱۵
تقویٰ والے کون ہین،	″
تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟	۳۱۶
اسلام مین برتری کا معیار،	۳۱۸

مضمون	صفحہ
اخلاص ۳۲۰ـ۳۲۴	
اخلاص کا مفہوم اور تشریح،	۳۲۰
توکل ۳۲۵ـ۳۳۶	
توکل کے غلط معنی،	۳۲۵
توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریح،	۳۲۵
صبر ۳۳۷ـ۳۵۵	
صبر کے لغوی معنی،	۳۳۷
وقت مناسب کا انتظار کرنا،	۳۳۸
بے قرار نہ ہونا،	۳۴۰
مشکلات کو خاطر میں نہ لانا،	۳۴۱
درگذر کرنا،	۳۴۲
ثابت قدمی،	۳۴۴
ضبطِ نفس،	۳۴۹
ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا،	۳۴۹
صبر کے فضائل اور انعامات،	۳۵۲
فتح مشکلات کی کنجی: صبر اور دعا،	۳۵۴
شکر ۳۵۶ـ۳۶۷	
شکر کی تعریف،	۳۵۶
لفظ کفر کی تشریح،	〃
شکر، اصل ایمان ہے،	۳۵۷
حمد،	۳۵۸
جسمانی نعمتوں کا شکریہ،	۳۶۰
مالی نعمتوں کا شکریہ،	۳۶۱
احسان کا شکریہ احسان ہے،	۳۶۲
خاتمہ،	۳۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ۝ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

دیباچہ

سیرۃ النبی صلعم کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اُس کی پانچوین جلد آپ کی خدمت مین پیش کی جارہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہو کہ وہ اپنے ایک گنہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے، اور اپنے بندون کے دلون کو اُس کے حسنِ قبول کے لیے کھول دیا ہو،

موضوع — اس جلد کا موضوع **عبادت** ہو، اس مین عبادت کی وہ حقیقت، اور اسلام مین اُس کے وہ اقسام و انواع اور ان مین سے ہر ایک کی وہ مصلحت و حکمت اور اس باب مین گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل، جو ذاتِ پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطاکار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہو کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے، جو صراطِ مستقیم ہے، اور وہ سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہو، تاہم وہی کہنا ہو جو بعض صحابہؓ اور اکابر نے (خدا اُن سے راضی ہو) فرمایا کہ "جو بات کہی گئی ہو اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہو، اور غلط ہے تو نفسِ خطاکار کا قصور ہو"

ان جلدون کا سیرت سے تعلق — ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن مین یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہو کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی

اور سیر کے واقعات سے نہین، جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہین، بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونون سے یکسان ہی، صاف لفظون مین یون کہنا چاہئے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالون کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا، اور وہ کیا لایا تھا، سیرت کی شروع کی تین جلدین پہلے سوال کا جواب تھین، اور باقی جلدین دوسرے سوال کا جواب ہین،

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل مین مین نے امکان بھر اُس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا، اُن زبانی بیانون اور تلقینون کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو مین فرمایا کرتے تھے وہ خود اپنے مکتوبات مین لکھتے ہین،

چاہتا ہون کہ ہر قسم کے مباحث سیرت مین آجائین، یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا، اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزون ہوگا، گو لمبا ہے، اور ابھی مین نے فیصلہ نہین کیا، (بنام مولنا حبیب الرحمان خان شروانی ۱۹۱۲ء)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ مین انھون نے ان حصون کا عنوان **منصب نبوت** رکھا تھا، اور لکھا تھا،

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہی، نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال، اور اخلاق ہی، اس بنا پر منصب نبوت کے کامون کی تفصیل اس حصہ مین کی گئی ہی، اس حصہ مین فرائض خمسہ، اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا، اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ، اور اُن کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے، اسی حصہ مین نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے، اور ان مین کیا کیا اصلاحین عمل مین آئین، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے کافی ہو سکتا ہے،" (جلد اول طبع اول ص۱۲ و طبع دوم ص۹۵)

گذشتہ چوتھی جلد، یہ پانچوین جلد اور آیندہ دو جلدین درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہین، منصب نبوت، عرب کی گذشتہ حالت، اور تعلیم عقائد، چوتھی جلد کا موضوع تھی، اور فرائض خمسہ اُن کی مصلحتین اور حکمتین اس جلد کا عنوان ہے، اخلاق و معاشرت کے نکتون کے لیے چھٹی جلد، اور بقیہ اوامر و نواہی کیلئے

جو معاملات سے متعلق ہین، ساتوین جلد ہوگی، ان مین سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح مین مصنّف اوّل کے ایمائ کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے، اُن کی مصلحتون اور حکمتون سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبون سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے، اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب مین کیا تعلیم پیش کی ہے، اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کیلئے کافی ہے،

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند،
انچہ اُستاد "مرا" گفت ہمان می گویم

حسنِ قبول اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے اس سلسلہ کو حُسنِ قبول کی سند عطا فرمائی،

قبولِ خاطر ولطف خدا داد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدّس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدّعیانہ فقرہ نہین نکلا مجھ سے فرمایا، "یہ کتاب وہان قبول ہوگئی" انکے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی، علاوہ اس کے کہ اسکی ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے مسلمانون مین اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی، ترکی مین اس کی تین جلدون کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا، فارسی مین اس کی چند جلدین کابل مین ترجمہ کی گئین اور اب تک منتظر طبع ہین، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی مین مکّہ معظمہ مین اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے،

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے، کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لیکر آج تک اُس زبان مین جس مین اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی چھوٹی بڑی سینکڑون کتابین نئے نئے دعوون کے ساتھ اسی کو سامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہین، اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان مین بحمد اللہ پیدا ہوگیا ہے، اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانون کا عام رجحان ہو گیا ہے،

امرائے اسلام کی امداد اس کتاب کے حسنِ قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنّفِ مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جونہی

شائع کیا، اس کی خدمت کے لیے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی جس کا ہر تارِ نفس محبت رسول صلعم کے دامن سے وابستہ تھا، یعنی ملت محمدی کی خادمہ، اور اُمت محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہان بیگم سابق فرمانروائے کشور بھوپال، (خدا اُن پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے، مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مرچکا، بلکہ اس خدا کیلئے تھا جس کو موت نہیں، اس لیے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی، مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا،

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرعنوان — کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہان بیگم زرافشاں ہے

رہی تالیف و تنقیدِ روایتہائے تاریخی — تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جن میں اک فقیر بینوا ہے، ایک سلطاں ہے

جب اس "فقیرِ بے نوا" کی وفات ہوئی، تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ "فقیرِ بینوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے" آخر یہ سلطان بھی چل بسی، اور تالیف و تنقید روایت کے ساتھ ساتھ "زرافشانی" کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہوگیا، مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جوان بخت کے سپرد کرگئیں جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ اُن کے ناتمام کارنامون کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھالیا، اور سیرۃ النبی صلعم کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہٗ برکت عطا فرمائے کہ اُن کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں، خلد اللہ ملکہٗ

۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپکر شائع ہوئی، تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰحضرت آصفجاہ سابع مظفر الملک و الممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کی پیشگاہ خسروی میں پیش کیا، حضور ممدوح کو

اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرورِ کائنات، فخرِ موجودات سید المرسلین محبوبِ رب العلمین احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ الوف التحیات والصلوات کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہی سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے، اور دوسری جلدون کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لیے تین دفعہ اور تین برس کے لیے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسون مین جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ مین پھنسا دیا تھا بیحد مدد ملی، اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز مین التجا ہے کہ وہ باقی جلدون کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، عمر گرامی زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلین طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے، دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر مین گذر جائے، اور آخر مین خوش قسمت سعدی کی طرح ہمین بھی یہ کہنے کا موقع ملے،

منزل تمام گشت و بپایان رسید عمر ۔۔۔ ما ہمچنان در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

مؤلف

سید سلیمان ندوی

شبلی منزل، اعظم گڑہ

۲۳ رجب سنہ ۱۳۵۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عملِ صالح

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لیکر آئے، اُسکا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات ۲ دو چیزون پر موقوف ہے، ایک ایمان، اور دوسری عملِ صالح، کتاب سیرۃ النبی کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح مین تھی، اب یہ پیش نظر حصہ عملِ صالح کی تشریح و بیان مین ہے، ایمان بنیادی اصولون پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے، اور عملِ صالح ان اصولون کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہین جب تک اُس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو،

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو انھین دو چیزون یعنی ایمان و عملِ صالح پر مبنی قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ عوام مین ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ عملِ صالح کو نہین، حالانکہ یہ دونون لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملاً یکسان اہمیت رکھتے ہین، فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے، اور عملِ صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جسطرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہین رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہین ہو سکتی،

ان دونون کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے، ایمان کی حیثیت اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ

کی ہو جن کو صحیح ماننے بغیر اقلیدس کی شکلون کا ثبوت محال ہے، لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلون کا عمل نہ کیا جائے، تو فن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش مین اقلیدس کا فن ایک ذرہ کار آمد نہیں ہو سکتا، اور نہ اُس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہین جو اس فن سے حاصل مقصود ہین،

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ مین قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیون آیتون مین بیان کیا ہے، مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عمل صالح دونون پر اسکو مبنی قرار دیا ہے، اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے، فرمایا

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، (عصر-۱)	زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے مین ہو لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے،

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہو کہ انھین افراد اور قومون پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہین جنھین ربانی حقائق کا یقین تھا، اور اس یقین کے مطابق اُن کے عمل بھی نیک ہوتے رہے، ایک دوسری آیت مین فرمایا،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ، ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ، اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ، (والتین-۱)	بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی مین پیدا کیا، پھر اسکو سب نیچون کے نیچے لوٹا دیا، لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو اُن کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے

اس آیت مین انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانون کے ہاتھون سے اسکی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے، لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون بچائے جاتے ہین، وہ جنہین ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہی، یہود سے جنکو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت نہیں کے ٹھیکہ مین ہو یہ فرمایا،

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ، (بقرہ-۹)	اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، وہی جنت والے ہین،

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہین، بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کریگا، وہ اُسی کی ملکیت ہو، فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ، (مائدہ-۱۰)	بے شک جو مسلمان ہین اور جو یہودی ہین، اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، نہ تو اُنپر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائینگے،

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول، کسی نسل و قومیت پر موقوف نہین اور نہ کسی مذہب و ملت کیطرف رسمی نسبت پر ہے، بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے، اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے، عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہو، جسمین نہ کبھی بال برابر فرق ہوا، اور نہ ہوگا، چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا،

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُہٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّہٖ فَیُعَذِّبُہٗ عَذَابًا نُّکْرًا، وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَہٗ جَزَآءَ نِ الْحُسْنٰی، (کہف-۱۱)	اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کریگا تو ہم اس کو دنیا مین سزا دینگے، پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹا کر جائیگا تو اس کو بری طرح سزا دیگا، اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کئے تو اسکے لئے بھلائی کا بدلہ ہے،
فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ ج وَاِنَّا لَہٗ کٰتِبُوْنَ، (انبیاء-۷)	تو جو کوئی نیک عمل کرے، اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی، اور ہم اُس کے (نیک عمل کو) لکھتے جاتے ہین،
فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ	تو ان کے بعد اُن کے ایسے جانشین ہوئے جنھون نے نماز کو برباد کیا، اور نفسانی خواہشون کی پیروی کی، تو وہ گمراہی سے ملین گے، لیکن جسنے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام

الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا، | کئے تو وہی لوگ جنت مین داخل ہونگے اور اُن کا ذرا سا حق
(سورۂ مریم-۴) | بھی مارا نہ جائے گا،

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتون سے یہ بات ثابت ہو کہ جنت کا استحقاق دراصل اُنہین کو ہے، جوایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہین، اور جو عمل سے محروم ہین، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہین، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے،

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ | اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ جنت کے باغون
الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ | مین ہونگے، اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس وہ ہے
هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ، ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ | جو وہ چاہین یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوشخبری
عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (شوریٰ) | اللہ اپنے ان بندون کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے

دوسری جگہ فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ | بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، اُن کی مہمانی
جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا، (کہف-۱۲) | کے لئے باغ فردوس ہین،

پھر آگے چل کر فرمایا،

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا | توجسکو اپنے پروردگار سے ملنے کی اُمید ہو توچاہیے کہ وہ
صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا، (کہف) | نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہو ورنہ حقیقت تو یہ ہو کہ جہان عمل کی کمی ہو، اسی کے بقدر ایمان مین بھی کمزوری ہو کیونکہ پرپورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا، انسانی فطرت کے خلاف ہو، آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اُسمین اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کرسکتا ہے، لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہین جانتا وہ بیباک اس مین ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے، اس لئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے،

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان، یا تنہا عمل کو نہین، بلکہ ہر جگہ دونون کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے،

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (حج) تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ آرام کے باغون مین ہونگے

اسی طرح قرآن پاک مین تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۵۰ موقعون پر یہ آیت ہی،

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، جو ایمان لائے اور اُنھون نے اچھے کام کئے،

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر مین ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہین جو ایک دوسرے سے الگ نہین ہو سکتے، اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونون پر یکسان ہی، البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ مین پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے،

جن مسلمانون سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہو وہ بھی وہی ہین جن مین ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ، (نور - ۷) تم مین سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے خدا نے وعدہ کیا کہ اُن کو زمین کا مالک بنائیگا،

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی اُنھین سے تھا،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا، (فتح - ۴) اللہ نے اُن مین سے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے بخشائش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا،

بعض آیتون مین ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی، اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نکوکاری کو جگہ دیگئی ہو مثلاً ایک آیت مین یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید مین کہ بہشت مین صرف وہی جائین گے، فرمایا،

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، (بقرہ - ۱۳) کیون نہین جس نے اپنے کو اللہ کے تابع کیا، اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اُس کے پروردگار کے پاس ہی، نہ ڈر ہے اُن کو اور نہ غم،

ان تمام آیتون سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے، کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہین، بلکہ ایمان کیساتھ عمل صالح پر ہے، اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے، جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب مین افراط اور تفریط نمایان تھی، عیسائیون مین جیسا کہ پال کے خطوط مین ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے، اور بودھ دھرم مین صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے، اور کہین صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے، مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونون اعمال کو ملاکر قرار دیا ہے، یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اسکو ایمان کہتے ہین، پھر یہ کہ ان اصولون کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے، اور ہر قسم کی کامیابیون کا مدار انہین دو باتون پر ہے، کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریون سے نجات نہین پاسکتا جب تک وہ اُن اصولون کے مطابق عمل بھی نہ کرے، اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہین، جب تک اُن اصولون کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے،

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ	وہ ایمان والے مراد کو پہنچے، جو نماز مین عاجزی کرتے ہین،
خَاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ	جو لغو باتون کی طرف رُخ نہین کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہین
وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ وَالَّذِينَ	جو اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرتے ہین......
هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ..... وَالَّذِينَ هُمْ	.... اور
لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ	جو اپنی امانتون اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہین، جو اپنی
يُحَافِظُونَ، أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ، (مومنون-۱)	نمازون کے پابند ہین، یہی بہشت کے وارث ہین،

مومنون ۱۲ / نام ۲۰۳

اس دنیا مین اللہ تعالی نے ہر شے کو ہمارے مادی علل و اسباب کے تابع فرمایا ہے، یہان کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہین ہوسکتی جب تک اُس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے، صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے، ہماری بھوک رفع نہین ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے ہم کو جد و جہد کرکے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ مین نگلنا بھی پڑے گا، اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگین ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتی ہین،

ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہین سکتے، جب تک اس یقین کیساتھ ہم اپنی ٹانگون کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دین، یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہو، اسی طرح اس دنیا مین عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے، البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولون کو صرف صحیح باور کرتا ہو وہ اُس سے بہرحال بہتر ہے، جو اُن کو سرے سے نہین مانتا، کیونکہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہِ راست پر آجانے اور نیک عمل بجالانے کی اُمید ہوسکتی ہے، اور دوسرے کے لئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے، اس لئے آخرت مین بھی وہ منکر کے مقابلہ مین شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے، کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا،

اعمالِ صالحہ کی قسمین "عملِ صالح" کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہین؛ تاہم انکی جلی تقسیمات حسب ذیل ہین، عبادات، اخلاق، معاملات،

اسلام مین لفظ **عبادت** کو بڑی وسعت حاصل ہے، اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہو جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو، اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کئے جائین تو وہ عبادات مین داخل ہین، مگر فقہا نے اصطلاحًا یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہین جنکی تفصیل یون کیجاسکتی ہو کہ اولًا اعمالِ صالحہ کی دو قسمین ہین، ایک وہ جسکا تعلق خاص خدا سے ہے اُس کو **عبادت** کہتے ہین، دوسری وہ جسکا تعلق بندون سے ہے، اُس کی بھی دو قسمین ہین، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے، اور دوسری وہ جسمین قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام **اخلاق** اور دوسرے کا **معاملات** ہو،

اعمالِ صالحہ کی اُنہین تینون قسمون کی تفصیل و تشریح سیرۃ النبیؐ کی موجودہ اور آیندہ جلدون کا موضوع ہے،

عبادات

یَاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (بقرہ)

عبادات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہین جنکو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ مین بجالاتا ہے، لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے، اس سلسلہ مین اللہ تعالی نے محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے انسانون پر جو حقیقت ظاہر فرمائی، اسکا اصل جوہر یہ نہین ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقون کے بجائے اسلام مین عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے، بلکہ یہ ہے کہ انسانون کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادات کے گذشتہ ناقص طریقون کی تکمیل مبہم بیانات کی تشریح، اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کیگئی،

اہل عرب جہان آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتون سے بیخبر تھے، وہان عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقون سے بھی ناواقف تھے، عرب مین جو یہود اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت اُن کے سامنے پیش نہ کرسکے تھے، اس عہد مین جو عیسائی فرقے عرب مین تھے، عقائد مین ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے، اور عبادات مین یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتون کو اپنے اوپر حرام کرکے عرب کے سنسان بیابانون اور پہاڑون مین انھون نے اپنی عبادت گاہین اور خانقاہین بنائی تھین، اور اُن مین بیٹھکر تمام دنیا کی جہد و جدو سعی و کوشش کے میدانون سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی لئے عربون کی شاعری مین عیسائیت کا تخیل ایک راہب متبتل" کی صورت مین تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امرو القیس کہتا ہے،

منارۃ ممسی راھب متبتل، دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کا شام کا چراغ،

عرب مین یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیون کے سبب سے سخت بدنام تھے، ان مین روحانی خلوص وایثار اور خداپرستی نام کو نہ تھی، وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن توراۃ کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے قرآن پاک نے ان دونون فرقون کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، یہودیون پر اُسنے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام، اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیون پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے[1]،

یہودی جادو، ٹونٹکا اور عملیات کے توہمات مین گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قومون کے بتون کے سامنے بھی سرجھکا لیتے تھے، عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدون کی تصویرون، مجسمون، یادگارون اور مقبرون کو پوجتے تھے، انھون نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کئے تھے، اور ان کا نام انھون نے دینداری رکھا تھا، سورۂ حدید مین قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونون کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونون کے فسق مین نہایت نازک فرق ہے، یہود کا فسق دین مین کمی اور سستی کرنا، اور نصاریٰ کا فسق دین مین زیادتی اور غلو کرنا تھا، اور خدا کے مشروع دین مین کمی اور زیادتی دونون گناہ ہین، اسی لئے قرآن نے دونون کو برابر کا فسق قرار دیا،

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَّإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي	اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا، اور اُن کی نسل مین نبوّت
ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُم مُّهْتَدٍ	اور کتاب رکھی، تو اُن مین سے کچھ راہ پر ہین، اور اکثر نافرمان
وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ، ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا	ہین، پھر اُن کے بعد اُن کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور
وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ	مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، اور انکو انجیل عنایت فرمائی، اور جنھون نے
الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً	عیسیٰ کی پیروی کی اُنکے دل مین نرمی اور رحمدلی بنائی، اور ایک رہبانیت
ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ	انھون نے نئی چیز نکالی، جو ہم نے ان پر نہین لکھی تھی،
رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا	لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انھون نے اس رہبانیت

[1] دیکھو سورۂ مائدہ رکوع ۹ و ۱۱، اور سورۂ حدید رکوع ۴ -

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ، (حدید-۴)

تو بھی جیسا نباہنا چاہیئے تھا نہین نباہا، توان مین جو ایماندار تھے انکو ہمنے انکی مزدوری دی، اور انمین بہت سے نافرمان ہین،

ان آیتون سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین مین اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے اسی لئے قرآن نے اُنکو بار بار کہا،

لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ، (نسآء-۲۳ و مائدہ-۱۰) اپنے دین مین غلو نہ کرو،

اُن کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا، وہ ابن اللہ ماننے لگے، اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولون کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے، بلکہ اُن کو قتل کرتے تھے،

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ (بقرہ و آل عمران) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قومون کے بتون کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ توراۃ مین یہودیون کی بت پرستی اور غیر خداؤن کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے، اور قرآن مین اُن کے متعلق ہے،

وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ، (مائدہ-۹) اور جنھون نے شیطان کو (یا بتون کو) پوجا،

آنحضرت صلعم نے عیسائیون کو تبلیغ کی،

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا
يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ
الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ، قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا
نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، قُلْ يٰاَهْلَ
الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا
تَتَّبِعُوْا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ و

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس، اس سے پہلے اور
پیغمبر گذر چکے، اور اُس کی مان ولی تھی، دونون (انسان)
تھے، کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیون)
کے لئے اس طرح کھول کر دلیلین بیان کرتے ہین، پھر
بھی دیکھ وہ کدھر اُلٹے جاتے ہین، (اُن سے) کہہ کہ کیا
تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانون) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ
مین نہ نقصان ہے نہ نفع، اللہ ہی سننے والا اور جاننے
والا ہے، جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے، اے کتاب والو!

اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ، (مائدہ - ۱۰)

اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو، اور اُن لوگون کے خیال پر نہ چلو، جو بہک گئے اور بہتون کو بہکایا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے،

اُن کی حالت یہ تھی،

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ، (توبہ - ۵)

خدا کو چھوڑ کر اپنے عالمون اور درویشون کو خدا بنا لیا تھا،

اس زمانہ میں عیسائیون کے جو گرجے اور پرستشگاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، اور حواریون، ولیون اور شہیدون کی تصویرین، اور مجسّمے نصب تھے، عبادت گذار اُن کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے، صحابہ میں سے جن لوگون کو حبشہ کی ہجرت کے اثناء میں ان معبدون کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اُن میں سے شاید بعض بی بیون کی نگاہ میں ان بزرگون کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلعم کے مرض الموت میں بعض ازواجِ مطہرات نے آپ سے اسکا تذکرہ کیا، اور اُن کی تصویرون اور مجسّمون کے حسن و خوبی کو بیان کیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا "خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انھون نے اپنے پیغمبرون کی قبرون کو عبادت گاہ بنا لیا، تم ایسا نہ کرنا، ان میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا، تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، اور اس میں اسکی تصویرین کھڑی کر دیتے تھے[۱]"

اڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدون کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ تمام تر حدیثِ مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں، خصوصاً تیسری اور پانچوین جلد میں حضرت عیسیٰؑ حضرت مریمؑ، سینٹ پال، اور متعدد ولیون اور شہیدون کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے، اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقون کی پرستش گاہون کے در و دیوار سے قرآنِ پاک کی صداقت کی آوازین آرہی ہیں اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات موم بتیون کی روشنی میں اُن کے آگے مراقبون اور تسبیحون میں سرنگون نظر آتے ہیں،

---

[۱] صحیح مسلم کتاب المساجد،

روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤن مین یہ منظر مین نے خود اپنی آنکھون سے دیکھا ہے اور اُس وقت محمد رسول اللہ صلعم کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھون کے سامنے تھی،

یہودیون اور عیسائیون کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے، مگر اسکی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بیخبر تھے، لات، عزیٰ، ہبل، اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتون کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے، اُن پر جانور قربانی کرتے، اور اپنی اولادون کو بھینٹ چڑھاتے تھے، سال کے مختلف اوقات مین مختلف بتخانون کے میلون مین شریک ہوتے تھے، اور پتھرون کے ڈھیرون کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے، خانۂ کعبہ یعنی خلیلِ بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتون کا مرکز تھا، اور اُن کی نماز یہ تھی کہ خانۂ کعبہ کے صحن مین جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتون کو خوش اور راضی رکھین، قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت صلعم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا، کہا کرتا تھا کہ "اے خدا مجھے نہین معلوم کہ مین تجھکو کس طرح پوجون اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا"[۱]

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر مین یہ ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت صلعم سُن رہے تھے[۲]،

وَاللّٰہِ لَوْلَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے،

اس شعر مین اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ہی کی تعلیم تھی، جسنے اہلِ عرب کو عبادت کے صحیح طریقون سے آشنا کیا،

عرب کے باہر بھی کہین خدائے واحد کی پرستش نہ تھی، بت پرست یونانی اپنے بادشاہون اور ہیروؤن کے مجسمے اور ستارون کے ہیکل پوجتے تھے، روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکون مین حضرت عیسیٰ حضرت مریمؑ، اور سینکڑون ولیون اور شہیدون کی مورتیان، اور ہڈیان، اور انکی مصنوعی یادگارین پوجی جارہی تھین، زردشت کی مملکت مین آگ کی پرستش جاری تھی، ہندوستان سے لیکر کابل و ترکستان اور چین اور جزائرِ ہند تک بودھ کی مورتون

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو، [۲] صحیح مسلم باب خیبر، شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتون مین مختلف ہے،

سماوُں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی، چین کے کنفوشس اپنے باپ دادوں کی مورتوں کے آگے خم تھے، خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، گنگا مائی، اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے، باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی، غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی،

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (بقرہ-۳)

لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا،

سابق کتب الٰہی کے امانت داروں کو آواز دی گئی،

يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللهَ، (آل عمران-۷)

اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عقیدۃً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں،

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی، اور پکار اٹھے،

رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا، (آل عمران-۲۰)

خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے، تو اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر،

ان واقعات کو سامنے رکھکر آنحضرت صلعم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپکی زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الٰہی میں نکلی تھی[۱]،

"خداوندا! تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لئے لڑنے پر آمادہ ہے، خداوندا! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی"

[۱] صحیح مسلم و جامع ترمذی غزوۂ بدر

خدا نے اپنے نبیؐ کی دعا سنی، اور قبول فرمائی، کیونکہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا، جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا، اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا،

صرف ایک خدا کی عبادت مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ مین نبوتِ محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہو کہ اُس نے دنیا کے معبدون سے تمام باطل معبودون کو باہر نکال کر پھینکدیا، باطل معبودون کی عبادت اور پرستش یکقلم محو کردی، اور صرف اس ایک خدا کے سامنے، خدا کی تمام مخلوقات کی گردنین جھکا دین، اور صاف اعلان کردیا کہ

اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا (مریم-۶)

آسمان و زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بنکر آنے والی ہے،

خدا کے سوا نہ تو آسمان مین، نہ زمین مین، نہ آسمان کے اوپر، اور نہ زمین کے نیچے، کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ، اور رکوع و قیام کی مستحق ہے، اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جاسکتا ہے، اور نہ اسکی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہو، اور نہ اسکی نذر مانی جاسکتی ہو، اور نہ اُس سے دعا مانگی جاسکتی ہو، ہر عبادت صرف اسی کے لئے، اور ہر پرستش صرف اُسی کی خاطر ہے،

اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، (انعام-۲۰)

بےشبہہ میری نماز اور میری قربانی، اور میری زندگی اور میری موت سب اُسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے،

کفار کو بتون، دیوتاؤن، ستارون، اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا، اور انھین ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہین لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا، تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا،

قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدۡتُّمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ

اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو مین نہین پوجتا، اور نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو، جس کو مین پوجتا ہون اور نہ مین اس کو پوجنے والا ہون جسکو تم نے پوجا اور نہ تم

اَعْبُدُ، لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ، (کٰفِرُوْن - ۱) اس کو پوچنے والے ہوجس کو مین پوجتا ہون، تمھارے لئے تمھارا دین ہے، اور میرے لئے میرا دین ہے،

خارجی رسوم کا وجود نہین خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم وجان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہین، نہ سورج کے نکلنے اور اسکی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا مین جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب[1]، نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت[2]، نہ دیوتاؤن، دیبیون، بزرگون اور ولیون کے مجسمون کو پیش نظر رکھنے کی اجازت[3]، نہ سامنے موم بتیون کے روشن کرنے کا حکم[4]، نہ گھنٹون اور ناقوسون کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنون کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑون کی قید[5]، ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اُس کے لئے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم ولباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہوجائے تو یہ بھی معاف ہے،

درمیانی آدمی کی ضرورت نہین اسلام مین عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان، اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہین، محمد رسول اللہ صلعم کے دین مین ہندؤن کی طرح نہ برہمن ہین، نہ پروہت ہین نہ پجاری ہین، نہ یہودیون کی طرح کاہن ہین، نہ ربّی ہین، نہ حاخام ہین، نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیون کی طرح عبادتون کی بجاآوری کے لئے پادریون اور مختلف مذہبی عہدہ دارون کی ضرورت ہے، اور نہ پارسیون کی طرح دستورون اور موبدون کی حاجت، یہان ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتین کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہان یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو مین جواب دونگا:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ، (مومن - ۶) تم مجھے پکارو مین تم کو جواب دونگا،

---

[1] جیسا کہ ہندؤن مین ہے [2] جیسا کہ پارسیون مین ہے، [3] جیسا کہ ہندؤن، عام بت پرستون اور رومن کیتھولک مین ہے، [4] جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیون مین ہے، [5] یہ چیزین یہودیون کے ہان ہین، پارسیون مین سپید کپڑون کی اکثر ضرورت ہے،

خارجی کشش کی کوئی چیز نہین | اکثر مذاہب نے اپنی عبادتون کو دلکش، دلفریب، مؤثر اور بارعب بنانے کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا، کہین ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازین تھین کہین ساز و ترنم، اور نغمۂ بربط کی دلکش صدائین تھین کہین جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور، لیکن دینِ محمدی کی سادگی نے اُن مین سے ہر ایک سے احتراز کیا، اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لئے دل کے ساز، اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیرون کا سہارا نہین لیا، تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کیساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے،

مکان کی قید نہین | ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چار دیواری مین محدود کیا ہے، بُت خانون سے باہر پوجا نہین، آتش خانون سے الگ کوئی نماز نہین، گرجون کے سوا کہین دعا نہین، اور صومعون سے نکل کر کوئی پرستش نہین، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کے طریقہ مین نہ کسی در و دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے، زمین کا ہر گوشہ، بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اُسکا معبد اور عبادت خانہ ہے، آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا "مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتین عنایت کین جو مجھ سے پہلے پیغمبرون کو نہین دی گئین منجملہ اُن کے ایک یہ ہے،

وجعلت لی الارض مسجدًا،[1] اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی،

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشتِ چمن مین ہو کہ ہنگامۂ کارزار مین، خشکی مین ہو کہ تری مین، ہوا مین ہو کہ زمین پر، جہاز مین ہو کہ ریل پر، ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو، اور اس کے سامنے سجدۂ نیاز بجا لا سکتے ہو، یہان تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد مین ہو جسمین سامنے بُت اور مجسمے نہ ہون تو وہان بھی اپنا فریضۂ عبادت ادا کر سکتے ہو،[2]

خاص خاص عبادتون کے وقت مختلف سمتون اور چیزون کی طرف رُخ کرنا بھی ہر مذہب مین ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ تمام مسلمانون کو ایک واحد رُخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ اُن مین وحدت کی شان نمایان ہو مسلمانون کے لئے بھی کسی ایک سمتِ خاص کی حاجت تھی، اور اس کے لئے اسلام مین مسجد ابراہیمی کی تخصیص کیگئی ہے کہ وہ دنیا مین خدائے واحد کی

[1] بخاری کتاب الصلاۃ باب قول النبی صلعم جعلت لی الارض مسجدا و طہورا، [2] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب الصلوۃ فی البیعۃ،

پرستش کا پہلا مقام ہے، لیکن اسکی حیثیت وہ نہین قائم کیگئی جو دوسرے مذاہب کے قبلون کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کے حدود سے پاک ہی، وہ ستارون کے رُخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہین، دنیا کے مختلف ملکون کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اُسکی طرف رخ کرتے ہین مغرب سے بھی مشرق سے بھی شمال سے بھی اور جنوب سے بھی کسی ایک سمت کی تخصیص نہین اور خود خانہ کعبہ کے صحن مین بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اُسکی طرف رخ کیا جاتا ہے، اگر کسی سبب سے اُس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے، تو جدھر بھی رُخ کرو، ادھر ہی خدا ہے، چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت مین اور عام نفل نمازون کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہین، جدھر سواری کا رُخ ہو اُدھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہی، لڑائیون مین ہر رُخ پر نماز برابر ادا کیجا سکتی ہے، اگر خدا نخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے، تب بھی اس رُخ کھڑا ہو جانا کافی ہی، کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو،

انسانی قربانی کی ممانعت | بعض مذاہب مین خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی، کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر، یا دریا مین ڈوبا کر یا آگ مین جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے، اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا، اور بتایا کہ خدا کی راہ مین اپنی جان قربان کرنا اصل مین یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت مین، یا کمزورون کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروانہ کیجائے اور مارا جائے، یہ نہین ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے، یا دریا مین ڈوب مرا جائے، یا آگ مین اپنے کو جلا دیا جائے، آپ نے فرمایا کہ "جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اُس کو جہنم مین اسی چیز سے سزا دیجائے گی"[1]

حیوانی قربانی مین اصلاح | کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب مین رائج تھا، عرب مین اسکا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتون پر چڑھا دیتے تھے، کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے، اور اُس کو چارہ گھاس نہین دیتے تھے، وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اُس کے خون کا چھاپ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ،

دیتے تھے، یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کرکے اُسکا گوشت جلا دیتے تھے، اور اُس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے اُن کی تفصیل صفحون میں بھی نہیں سما سکتی، اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے، بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اُس کا گوشت چیل، اور کوّون کو کھلا دیتے تھے، پیغامِ محمدی نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا، اُس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں، بلکہ تمہارے دل کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا،

لَن يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِن — اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا،

يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنكُمْ (حج - ۵) — بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے،

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہلِ استطاعت کیلئے جو موقع حج پر نہ گئے ہوں مقامِ حج کی یاد کے لیے قربانی مسنون کیگئی ہے، تاکہ اُس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا، اور خدا نے اُس کو آزمایش میں پورا ہوتا دیکھ کر اُس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھدی، اور اُس کے پیرووں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی،

اسی کے ساتھ پیامِ محمدی نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا، یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں ہے، بلکہ اس سے مقصود دو ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اُس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور اُن کو ہماری غذا کے لئے مہیا کیا، اور دوسرا یہ کہ اُنکا گوشت غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کیجائے، چنانچہ فرمایا،

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ — ہمنے ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی، تاکہ وہ ان جانوروں پر

اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَإِلٰهُكُمْ — خدا کے نام کی یاد کریں جو ہم نے اُن کو روزی کی، تو تمہارا

إِلٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ، — خدا ایک خدا ہے، اُسی کے آگے سر جھکاؤ، اور عاجزی کرنے

(حج - ۵) — والے بندوں کو خوشخبری سنا دے،

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ	اور قربانی کے جانورون کو خدا کی نشانیان بنایا ہے تمھارے
لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا	لئے اُن مین بہت فائدے ہین، اُن کو قطار مین کھڑا کرکے
صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا	تم ان پر خدا کا نام لو، تو جب وہ پہلو کے بھل جھکین،
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ	(یعنی ذبح ہو چکین) تو اُن مین سے کچھ خود کھاؤ، اور باقی
سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ،	قناعت پسند فقیرون اور محتاجون کو کھلا دو، اسی طرح ہمنے
(حج -۵)	اُن جانورون کو تمھارے کام مین لگایا ہو کہ خدا کا شکر ادا کرو،

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت مین یہ فعل شرک، اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے، وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ، عرب مین دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ مین قربانی کرتے تھے، اسلام کے بعد لوگون نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا، آپنے فرمایا" خدا کے نام سے جس مہینہ مین چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لئے کرو، اور (غریبون کو) کھلاؤ، غرض قربانی کی یہی دو حقیقتین ہین، صرف خون بہانے کے لئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہین، اور نہ یہ خون بہانا مشرکون کی دیبیون اور دیوتاؤن کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہی،

مشرکانہ قربانیون کی ممانعت

اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیان جو عرب مین جاری تھین بند کر دی گئین، عرب مین جانورون کے قربانی کرنے، اور اُن کو بتون پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتون کے نام پر عموماً اسکی قربانی کر دیتے تھے، اور اسکی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے، اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے، رجب کے پہلے عشرہ مین ایک قسم کی قربانی کیجاتی تھی جسکا نام عتیرہ تھا اسلام نے ان دونون قربانیون کو ناجائز قرار دیا، اور رجب کی تخصیص باطل کر دی،

قَالَ لَا فَرَعَ وَلَا عَتِيْرَةَ [۲]	آپنے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہین ہی،

بتون کے نام پر مختلف نامون سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے، اور اُن کو کوئی شخص کسی دوسرے کام مین

---

[۱] ابوداؤد، باب فی العتیرہ، جلد دوم ص۵، [۲] ابوداؤد کتاب الاضاحی جلد ۲ ص ۵،

استعمال نہین کرسکتا تھا چنانچہ قرآن مجید مین اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی،

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ، (مائدہ-۱۴) نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، اور نہ حام بنایا،

مردون کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحین کین اُس کے سلسلہ مین اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا،

لَا عَقْرَ فِي الْاِسْلَامِ،[1] اسلام مین قبر کے پاس جانورون کا ذبح کرنا جائز نہین،

عرب جاہلیت مین یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی وسخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانورون کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا، پھر اُس کے مقابل مین دوسرا ذبح کرتا، اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جبکے اونٹ ختم ہو جاتے، یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا، وہ ہار جاتا، اسلام نے اس جانی مال کے اتلاف کو روک دیا[2]

تجرد، ترک لذائذ، ریاضات، اور تکالیف شاقہ عبادت نہین،

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے، اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اُسکی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے، اسی لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفین دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائیگا، اسی قدر روح مین زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئیگی، چنانچہ یونانی فلسفیون مین اشراقیت، عیسائیون مین رہبانیت اور ہندوون مین جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کرلیتا، کوئی ہفتہ مین یا چالیس دن مین ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا، اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا، کوئی چلہ کی سردی مین اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا، یا بیٹھا رہتا تھا، اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانون اور غارون مین چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد، اور ترک دنیا کرکے اہل وعیال اور زن وفرزند کے تعلق سے نفرت رکھکر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا لیکن نبوت محمدیؐ نے یہ راز آشکارا کیا، کہ ان مین سے کوئی چیز عبادت نہین، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی

[1] ابو داؤد کتاب الجنائز باب کراہیۃ الذبح عند القبر جلد ۲ ص ۳۰۴۔
[2] ابو داؤد کتاب الاضاحی، جلد ۲، ص ۵۵،

کا باعث ہو، اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہو، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہو، نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہو، خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہو، اُسنے کہا،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (بقرہ۔ اخر) خدا کسی کو اس کی گنجایش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا،

اسلام میں، روزہ ایک ایسی چیز تھی جسکو بعضوں کے لئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں، اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا،

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ ۲۳) خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں،

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا، تو ساتھ ہی فرما دیا،

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيلًا۔ (آل عمران ۱۰) جسکو زاد راہ اور چلنے کی استطاعت ہو، اسی پر حج فرض ہے،

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (حج ۱۰) تمھارے لئے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی،

آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا،

اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ۔[1] یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کریگا، تو دین اسکو مغلوب کر دیگا،

اور فرمایا،

اِنَّمَا اَنَا بُعِثْتُ بِالْمِلَّةِ السَّمْحَةِ اَوِ السَّهْلَةِ الْحَنِيفِيَّةِ الْبَيْضَاءِ۔[2] میں تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں،

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا، خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دینِ حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا، اور کہا،

---

[1] جمع الفوائد طبع میرٹھ جلد اول صفحہ ۳ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری و سنن نسائی، [2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶،

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ — اور عیسائیون نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور

إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ — ہم نے اُن کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم

رِعَايَتِهَا، (حدید-۴) — نہین دیا تھا، تو جیسا چاہئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا'

ان لوگون سے جنھون نے اچھے کھانون اور زیب وزینت کی جائز چیزون کو بھی اِس لیے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ — پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب وزینت اور رزق کی اچھی چیزون

وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ، (اعراف-۴) — کو جنکو خدا نے اپنے بندون کیلئے بنایا، کس نے حرام کیا،

اسلام نے اس مسئلہ مین یہانتک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے بعض بی بیون کی خوشنودیِ مزاج کے لئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اِسپر عتاب آیا، خدا نے فرمایا،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ — اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لئے حلال کیا، تو اس کو اپنی

تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ — بی بیون کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیون کرتا ہے،

رَّحِيمٌ، (تحریم-۱) — اور خدا بخشنے والا مہربان ہے،

صحابہؓ مین بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبون کے اثر، یا ذاتی میلانِ طبع کے سبب سے تجرد، ترکِ لذائذ، اور ریاضتِ شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے آنحضرت صلعم نے اُن کو اس سے باز رکھا، اور فرمایا کہ مین یہ شریعت لیکر نہین آیا، قدامہؓ بن مظعون اور اُن کے ایک رفیق نے دربارِ رسالت مین حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم مین سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا، اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے، آپنے فرمایا: مین تو دونون باتین کرتا ہون"

یہ سنکر دونون صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے[1]،

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ نے جو ایک نہایت عابد وزاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھینگے

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم،

اور رات بھر عبادت کرین گے، آنحضرت صلعم کو خبر ہوئی تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ "اے عبداللہ! تم پر تمھارے جسم کا بھی حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ مین تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے[1]"۔ اسی قسم کی نصیحت آپ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی، آپ کو اُن کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت مین مصروف رہتے ہین، بیوی سے کوئی تعلق نہین رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہین، رات کو سوتے نہین، آپ نے اُن کو بلا کر پوچھا کہ "کیون عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے" عرض کی "خدا کی قسم مین نہین ہٹا ہون، مین آپ ہی کے طریقہ کا طلبگار ہون" فرمایا "مین سوتا بھی ہون اور نماز بھی پڑھتا ہون، روزہ بھی رکھتا ہون اور افطار بھی کرتا ہون اور عورتون سے نکاح بھی کرتا ہون، اے عثمان خدا سے ڈرو کہ تمھارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہے، تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی[2]"۔

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ مین واپس گئے، تو انھون نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمتِ اقدس مین حاضر ہوئے تو اُن کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ انکو پہچان نہ سکے، انھون نے اپنا نام بتایا، تو فرمایا "تم خوش رو تھے، تمھاری صورت کیون ایسی ہوگئی" عرض کی "یا رسول اللہ صلعم جب سے آپ سے مل کر گیا ہون، متصل روزے رکھتا ہون" فرمایا "تم نے اپنی جان کو کیون عذاب مین ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ مین ایک روزہ کافی ہے" انھون نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی، تو آپ نے مہینہ مین دو روزون کی اجازت دی، انھون نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ مین تین روزے کر دیئے، انھون نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپ نے ماہ حرام کے روزون کی اجازت دی[3]، ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواجِ مطہرات کی خدمت مین حاضر ہو کر آپ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسولِ خدا صلعم کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انھون نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلعم سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہین، ان مین سے ایک صاحب نے کہا مین تو رات بھر نمازین پڑھوں گا، دوسرے صاحب بولے مین عمر بھر

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم ۔ [2] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ ۔ [3] ابوداؤد باب صوم اشہر الحرم ۔

روزے رکھون گا، تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ مین عمر بھر مجرد رہونگا، کبھی نکاح نہ کرونگا، آنحضرت صلعم اُن کی یہ گفتگو سُن رہے تھے، اُن کو خطاب کرکے فرمایا "خدا کی قسم مین تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہون تاہم مین روزہ رکھتا ہون، اور افطار بھی کرتا ہون، راتون کو نماز بھی پڑھتا ہون، اور سوتا بھی ہون، اور عورتون سے نکاح بھی کرتا ہون، جو میرے طریقہ پر نہین چلتا وہ میری جماعت مین نہین[1]"

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہین کرسکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرادین، انھون نے آنحضرت صلعم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی، تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وغیرہ صحابہ کہتے ہین اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار تھے[2]

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام بلیغ کیساتھ لوگون کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا،

آپ نے کبھی کبھی بذاتِ خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ نے بھی آپ کی پیروی مین اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہین، اس لئے انھون نے افطار نہ کیا، آپ نے دو دن روزہ رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا، آپ نے افطار کرلیا، اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو مین اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب مین غلو کرنے والون کا سارا غلو رہجاتا، صحابہؓ نے عرض کی کہ یارسول اللہ پھر آپ کیون کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہین، فرمایا تم مین سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے[3]، اسی لئے اسلام مین عام امت کیلئے یہ روزے نہین ہین،

ایک دفعہ ایک مسجد مین آپ کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کھبے مین ایک رسّی لٹک رہی ہو، دریافت کیا تو لوگون نے کہا، یہ زینبؓ نے باندھی ہو، رات کو نماز مین جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہین تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہین، یہ سنکر آپ نے فرمایا، یہ رسّی کھول دو، لوگو! تم اُسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم مین نشاط باقی رہے، جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے[4]"

---

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح [2] صحیح بخاری وابوداؤد کتاب النکاح، [3] صحیح مسلم کتاب الصیام، [4] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی وابوداؤد

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری حضرت عائشہؓ نے کہا "یہ خولاء ہے، لوگ کہتے ہین کہ یہ رات بھر نہین سوتی اور عبادت مین مصروف رہتی ہے" فرمایا کہ "یہ رات بھر نہین سوتی! لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے"[۱]

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازون مین مشغول رہتے تھے، ان کو مخاطب کرکے فرمایا

اکلفوا من العمل ما تطیقون فان اللہ لا	اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کرسکو، کیونکہ جب تک
یمل حتی تملوا فان احب العمل الی اللہ	تم نہ اکتا جاؤ، خدا نہین اکتاتا، خدا کے نزدیک سب سے
ادومہ وان قل[۲]	پسندیدہ وہی کام ہے جسکو تم ہمیشہ کرسکو اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو،

حج مین رہبانیت کی بہت سی باتین عرب مین جاری تھین بعض حاجی یہ عہد کرلیتے تھے کہ وہ اس سفر مین زبان سے کچھ نہ بولین گے، یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کرین گے، اور کسی سواری پر نہ چڑھینگے، یا اس سفر مین کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی مین چلین گے، بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک مین نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے، اور اُس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقون کو منسوخ کردیا، کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہین، حضرت عقبہ بن عامرؓ کی بہن نے یہ نذر مانی تھی، کہ وہ پیدل حج کرینگی، عقبہ نے آکر آنحضرت صلعم سے فتویٰ پوچھا، آپنے جواب دیا خدا کو تمھاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہین، اُن سے کہو کہ وہ سوار ہوکر حج کرین[۳] اسی طرح آپنے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپنے اُس کو سوار ہونے کا حکم دیا، اُس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے آپنے فرمایا "مین یہ جانتا ہون کہ یہ قربانی کا جانور ہے لیکن تم اس پر سوار ہو لو"[۴] ایک دفعہ حج کے سفر مین آپنے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود چل نہین سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونون طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپنے دریافت فرمایا، تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے، فرمایا "خدا کو اسکی حاجت نہین، کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب مین ڈالے، اسکو سوار کردو"[۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) عن انس جلد اول صفحہ ۲۰ طبع میرٹھ، باب الاقتصاد فی الاعمال [۱] جمع الفوائد بحوالہ صحیحین موطا و نسائی، [۲] ابو داؤد و باب القصد فی الصلوٰۃ [۳] ابو داؤد و مسند ابن جارود و کتاب الایمان والنذور [۴] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۰۸، [۵] ابو داؤد و ترمذی و نسائی و ابن جارود و کتاب الایمان والنذور،

ایکدفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ مین ننگے سر کھڑا ہے، آپؐ نے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے، اور اسکی یہ کیا حالت ہے، لوگون نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہیگا، بیٹھے گا نہین اور نہ سایہ مین آرام کریگا، اور نہ بات کریگا، اور برابر روزے رکھیگا، آپؐ نے فرمایا کہ اس سے کہو کہ باتین کرے، بیٹھے، سایہ مین آرام لے، اور اپنا روزہ پورا کرے[۱]؛

حج مین دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک مین نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اُس کو جانور کی طرح اُسکی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپؐ نے جا کر نکیل کاٹ دی، اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اسکو طواف کراؤ[۲]؛

اسی قسم کی غیر ضروری ریاضتون کے متعلق عیسائی راہبون کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آپؐ نے فرمایا،

لا تشددوا علی انفسکم فانما اھلك من	اپنی جانون پر سختی نہ کرو، کہ تم سے پہلے قومین اپنی جانون پر
کان قبلکم بتشدید ھم علی انفسھم	سختی کرنے سے تباہ ہوئین، اور انکی بقیہ نسلین آج بھی گرجون
وستجدون بقایاھم فی الصوامع والدیار[۳]	اور دیرون مین تم کو ملین گی،

خاتم الانبیاء صلعم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقون کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، آپؐ نے فرمایا،

لا صرورۃ فی الاسلام، (ابوداؤد)	اسلام مین رہبانیت نہین،

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہین، اکثر مذاہب نے دینداری اور خداپرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ، یا جنگل مین بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہین قرار دیا، عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندون کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہمجنسون سے الگ ہو کر ایک گوشہ مین بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے

[۱] صحیح بخاری، ابوداؤد و ابن جارود کتاب الایمان والنذور، [۲] صحیح بخاری ایمان و نذور، [۳] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط للطبرانی، وابوداؤد صفحہ ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال،

اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہین اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے ازدحام اور علائق کے ہجوم مین گرفتار ہوکر ان مین سے ہر ایک کے متعلق جو اُس کا فرض ہو اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیرون کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے، جو ان سب جھمیلون کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولین، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترکِ فرض نہین، بلکہ اداے فرض ہے، ترکِ عمل نہین، بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہین، بلکہ کرنا ہے،

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلعم نے بعض اُن صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتون کو عبادت کرتے تھے، فرمایا "اے فلان تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمھاری بیوی بچون کا بھی حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہے، تمھاری جان کا بھی حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی حق ہے" اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر مین عبادت ان حقوق کو بجالانا ہے، ان حقوق کو ترک کردینا نہین، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ مین ایک صحابی کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جسمین موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیان بھی تھین، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لئے یہ جگہ بہت پسند آئی، خدمتِ بابرکت مین آکر عرض کی، یا رسول اللہ مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے، جہان ضرورت کی سب چیزین ہین، جی چاہتا ہے کہ وہان گوشہ گیر ہوکر ترکِ دنیا کرون، آپنے فرمایا "مین یہودیت اور عیسائیت لیکر دنیا مین نہین آیا ہون، مین آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہون"[۱]۔

اسلام سے پہلے آنحضرت صلعم غارِ حرا مین کئی کئی دن جاکر رہا کرتے تھے اور عبادتِ الٰہی مین مصروف رہتے تھے، لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپکے پاس آیا، اور دعوت و تبلیغ کا بار آپکے مبارک کندھون پر رکھا گیا، شب و روز مین رات کی چند ساعتین اور سال مین رمضان کے چند اخیر دن، گوشۂ عزلت اور زاویۂ تنہائی مین بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کیساتھ ملکر خالق کی عبادت، اور پھر مخلوق کی خدمت مین صرف ہوتے تھے، اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرزِ عمل رہا، اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادی عبادت تھی[۲]،

---

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۶۶، [۲] اسلام مین گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعون پر ہے، ایک اس شخص

اسلام مین عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا، کہ اسلام مین عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہین، جو دوسرے مذہبون مین پایا جاتا ہے، عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاحِ شریعت مین خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا، اور اُس کے احکام کو بجا لانا ہی، اسی لئے قرآن پاک مین عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ، (مومن - ۶) — جو میری عبادت سے غرور کرتے ہین، وہ جہنم مین جائین گے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷) کیلئے جس مین فطرۃً بدی ہو جس کی سرشت دوسرون کو نفع پہنچانا نہین بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت صلعم نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگون سے قطع تعلق کرلے، صحیح بخاری مین ہو کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا" ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ مین قربان کرتا ہے، دوسرے وہ جو کسی گھاٹی مین بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگون کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے"؎ اس تعلیم نبوی نے انسانون کی دو قسمین کردین، ایک وہ جنکو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے، تو اُن پر یہ فرض ہو کہ وہ مجمع اور ہجوم مین رہ کر اُن کی بھلائی کا فرض انجام دین، یہانتک کہ اس راہ مین اُن کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور اُن کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہین جنمین طبعًا مردم آزاری اور دوسرون کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہو، اُن کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی مین ہو کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھکر خدا کی عبادت مین اپنا وقت صرف کرین، تاکہ وہ گناہ کے بار سے اور لوگ انکے آزار سے محفوظ رہین،

دوسرا موقع جسمین آنحضرت صلعم نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے، وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک مین فتنۂ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو، تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے، چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ" ایک ایسا زمانہ لوگون پر آئیگا جس مین ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جسکو لیکر وہ بارش کی جگہون اور پہاڑون کی گھاٹیون کو تلاش کریگا، تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنون سے بچا سکے" (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہین، پہلے موقع مین ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا، جماعت اور فرد دونون کے لئے فائدہ مند ہے، اور دوسرے موقع پر جبکہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہے اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھکر اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے،

؎ صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء،

فرشتوں کے متعلق فرمایا،

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (انبیاء۲) | جو اس کے پاس ہیں وہ اُنکی عبادت سے غرور نہیں کرتے

سعادت مند اور با ایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا،

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ، (سجدہ-۲)

میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جنکو ان آیتوں سے سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور غرور نہیں کرتے،

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں، اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا، اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے، تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اُس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بنا پر صحیفۂ محمدی کی زبان میں "عبادت" بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود، خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو، اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے، لیکن اس سے اُسکا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ **عبادت** نہ ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لیے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے، اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے، قرآن پاک میں یہ نکتہ جابجا ادا ہوا ہے،

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰى اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (لیل-۱)

دوزخ سے وہ پرہیزگار بچالیا جائیگا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے، اس پر کسی کا احسان باقی نہیں جس کا بدلہ اس کو دینا ہو، بلکہ صرف خدا ے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا،

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ۳۷) | صرف خدا کی ذات کی طلب کیلئے جو تم خرچ کرو،

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ۔ (انسان-۱) — ہم تو صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے ہین،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ، الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ، (ماعون-۱) — پھٹکار ہو ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہین اور جو دکھاوے کے لئے کام کرتے ہین،

قرآن کی ان آیتون کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلعم نے ان مختصر لیکن بلیغ فقرون مین فرمادی ہو کہ

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات، (صحیح بخاری و مسلم) — اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہو،

اسی کی تشریح آپ نے اُن لوگون سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کرکے مدینہ منورہ آرہے تھے،

لكل امرء ما نوى فمن كانت هجرته الى الله و رسوله فاجره على الله، ومن كانت هجرته الى دنيا يصيبها او امرءاة ينكحها فهجرته الى ما هاجر اليه، (بخاری باب اوّل) — ہر شخص کو وہی ملیگا جس کی اُس نے نیت کی، اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اُسکا ثواب خدا دیگا، اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہو، یا کسی عورت کیلئے ہے، تو اوس کی ہجرت اُسی کی طرف ہے جس کی نیت سے اُس نے ہجرت کی،

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلعم نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس مین پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہو، اس مین کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہین ہے، بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی، اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو، عبادت ہو، اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھون دے ڈالو، تو وہ عبادت نہین، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اُسکے حکم کی بجاآوری کے لئے، چند کوڑیان بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہو،

تعلیم محمدی کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی، اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے، اور یہی "عبادت" سے اسلام کا اصلی مقصود ہو،

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، (بقرہ-۳) — اے لوگو! اپنے اُس پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تمکو اور تم سے پہلون کو پیدا کیا، تا کہ تم کو تقویٰ حاصل ہو،

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصولِ تقویٰ ہے،

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل مین تمام نیک کامون کی تحریک اور برے کامون سے نفرت ہوتی ہے، آپنے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تقویٰ کی جگہ یہ ہے[1]، اور قرآن نے بھی "تقوی القلوب" دلون کا تقویٰ" کہکر اسی نکتہ کو کھولا ہے، اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام مین عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز، روزہ اور تمام عبادتین سب اُسی کے حصول کی خاطر ہین، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جنسے شریعت کی نظر مین یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہین،

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت مین یون ادا کرسکتے ہین، کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند اُن مخصوص اعمال کا نام ہے، جنکو انسان خدا کے لیے کرتا ہے مثلاً نماز، دعا، قربانی لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا، اس تعلیم کے رو سے، ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اسکی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو، اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہے، اسلام مین خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو، یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لئے ہو، لیکن اُس کام کرنے سے اُس کام کے کرنے والے کا مقصود نمایش، دکھاوا، حصولِ شہرت، یا دوسرون کو احسان مند بنانا، وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضامندی ہو،

اس تشریح کے رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا، محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے اس کو دفعۃً مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام مین دو حریف کی نہین رہتی، بلکہ دو دوست کی ہوجاتی ہے، دنیا کے وہ تمام کام جنکو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہین، اسلام کی نظر مین اگر وہ کام اسی طرح کیے جائین لیکن انکی غرض و غایت کوئی مادی خودغرضی و نمایش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اُس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہین، دین کے کام ہین، اس لئے دین اور دنیا کے کامون مین، کام کا تفرقہ نہین، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے، تم نے دیکھا

---

[1] مسلم کتاب البر والصلہ باب تحریم ظلم المسلم، [2] حج رکوع ۴،

پڑھا کہ آنحضرت صلعم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت مین مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، کہ اُس کو آرام دو، تمھاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اُس کو کچھ دیر سونے دو، تمھاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اسکی تسلی کرو، اور تمھارے مہمان کا بھی حق ہے[1]، کہ اُس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اُسکی عبادت ہی، چنانچہ پاک روزی کھانا اور اسکا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (بقرہ ۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزین روزی کی ہین، اُن کو کھاؤ، اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہی، ایک اور آیت مین توکل یعنی کامون کے لئے کوشش کرکے نتیجہ کو خدا پر سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (هود-۱۰)

اُسکی عبادت کرو اور اُس پر بھروسہ رکھو،

اسی طرح مشکلات مین صبر و استقلال بھی عبادت ہی، فرمایا

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ (مریم-۴)

اسکی عبادت کر اور صبر کر،

کسی شکستہ دل سے اسکی تسکین و تشفی کی بات کرنا، اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہی، ارشاد ہی،

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى (بقرہ-۳۶)

اچھی بات کہنا اور معاف کرنا، اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے ستانا ہو،

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلعم نے ان الفاظ مین فرمائی ہی،

كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ (بخاری کتاب الادب)

ہر نیکی کا کام خیرات ہی،

تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ

تمھارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہی،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضیف،

واماطۃ الاذیٰ عن الطریق صدقۃٌ ،　　　راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے،

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتون سے بڑھ کر ہے، فرمایا،

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد　　　بیوہ اور غریب کے لئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا

فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النھار و　　　کی راہ مین جہاد کرنے والے کے برابر ہے، اور اس کے برابر

یقوم اللیل، (بخاری، ادب)　　　ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو،

باہم لوگون کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا، اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جسکا درجہ نماز، روزہ،

اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے، آپ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا،

الا اُخبرکم بافضل من درجۃ الصیام والصلوٰۃ　　　کیا مین تم کو روزہ نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی

والصدقۃ،　　　چیز نہ بتاؤن،

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے، فرمایا،

اصلاح ذات البین[1]،　　　وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے،

حضرت سلمانؓ فارسی ایک دوسرے صحابی حضرت ابوذرؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ اُن کی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہین، حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی، تو بولین کہ تمھارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہین ہے، اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا، تو ابوذرؓ نے کہا مین روزے سے ہون، حضرت سلمانؓ نے کہا مین تو تمھارے بغیر نہین کھاؤنگا، آخر انھون نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابوذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو، پچھلی پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، اور کہا اب نماز پڑھو، چنانچہ دونون نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے اُن سے کہا اے ابوذرؓ! تمھارے رب کا بھی تم پر حق ہے، اور تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو، حضرت ابوذرؓ نے حضرت صلعم کی خدمت مین آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپ نے فرمایا،

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین ص ۱۹۲،

کہ "سلمان نے سچ کہا"[1]

لوگون نے آنحضرت صلعم سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ تمام کامون مین سب سے بہتر کون کام ہے" فرمایا "خدا پر ایمان لانا، اور اسکی راہ مین جہاد کرنا" لوگون نے پوچھا "کس غلام کے آزاد کرنے مین زیادہ ثواب ہے" ارشاد ہوا جس کی قیمت زیادہ ہو، اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو" انھون نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو فرمایا "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو، یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو، اس کا کام کر دو" پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے، فرمایا "تو پھر یہ کہ لوگون کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو"[2]

ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے فرمایا، خدا اپنے بندون سے کہیگا کہ "مین نے تم سے کھانا مانگا، تم نے نہ کھلایا" وہ عرض کرینگے "خداوندا! تو نے کیسے کھانا مانگا، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمائیگا "کیا تم کو معلوم نہین کہ میرے فلان بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے" "اے ابن آدم! مین نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا" وہ کہیگا کہ "اے پروردگار! مین تجھکو کیسے پانی پلاؤن، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" وہ فرمائیگا "تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلان بندہ نے پیاس مین تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا" "اے ابن آدم! مین بیمار ہوا، تو نے میری بیمار پرسی نہ کی" وہ کہیگا "اے پروردگار! مین کیونکر تیری بیمار پرسی کرون، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمائیگا "تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا، یا مجھے اس کے پاس پاتا"[3]

اس مؤثر طریقۂ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے، اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہین؛ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ مین دیدین، آپ نے انھین بتایا کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالی کی ذات مطلوب ہو، اس کا تم کو ثواب ملیگا، یہانتک

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف صفحہ ۹۰۶ ، [2] ادب المفرد امام بخاری باب معونة الرجل اخاہ ،
[3] ایضاً باب عیادة المرضیٰ ،

کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ مین بھی دو اُس کا بھی ثواب[۱] ہی" ابو مسعود انصاری سے ارشاد فرمایا "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ[۲] ہی" غریب و نادار صحابہؓ نے دربارِ رسالت مین ایک دن شکایت کی کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب مین بڑھ گئے، ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہین، وہ بھی روزے رکھتے ہین، اُن کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہین، جو ہم نہین بجالا سکتے" فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہین دی ہی جسکو صدقہ کرسکو، تمہارا سبحان اللہ اور الحمد للہ کہنا بھی صدقہ ہے، یہانتک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے، وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے، لوگون نے کہا "یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے یہ کرتا ہے" فرمایا کہ "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اُس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیون نہ ملیگا"[۳]

محمد رسول اللہ صلعم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا، کہ حسنِ عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم مین اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے، اور کتنی توہمِ انسانی غلطیون کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہوجائیگا کہ وحیِ محمدی نے بالکل صحیح طور سے خلقتِ انسانی کی غرض و غایت، عبادتِ الٰہی قرار دی ہی،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ   مین نے انسانون کو اور جنون کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ

(ذٰریٰت - ۳)   وہ میری عبادت کرین،

اس آیتِ پاک مین عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہین ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہی بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کامون تک وسیع ہی جنکے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اُس کی اطاعت، اور اسکی خوشنودی کی طلب ہو، اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہین، جنکے بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے اس کی خلقت ہوئی ہی، یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا،

عام طور سے مشہور ہی کہ شریعت مین چار عبادتین فرض ہین، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، درحقیقت یہ چارون فریضے عبادت کے

---

[۱] ادب المفرد باب یوجر فی کل شی، [۲] صحیح بخاری کتاب النفقات، [۳] ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقۃ،

سیکڑون وسیع مضمون، اور اُن کے جزئیات کے بے پایان دفتر کو چار مختلف بابون مین تقسیم کر دیتے ہین، جنمین سے ہر ایک فریضۂ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے، جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقرون مین ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھدیتے ہین، اسی طرح یہ چارون فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کامون کو چار مختلف عنوانون مین الگ الگ تقسیم کر دیتے ہین اس لئے ان چار فرضون کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کامون کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہین،

۱۔ بندون کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جنکا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے، ایک مستقل باب ہے، جس کا عنوان نماز ہے،

۲۔ وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے صدقہ اور زکوٰۃ ہے

۳۔ خدا کی راہ مین ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا، اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشون کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا، جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ مین حائل ہوتی ہین، روزہ ہے، یا یون کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے،

دنیائے اسلام مین ملتِ ابراہیمی کی برادری، اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتۂ اتحاد کا قیام، اور اس مرکز کی آبادی اور کسبِ روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرِ عنوان حج ہے،

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہی اصولِ چہارگانہ کے تحت مین داخل ہین، اسی لئے آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "اسلام کی بنیاد پانچ ستونون پر قائم ہے، توحید[۱] و رسالت کا اقرار کرنا، نماز[۲] پڑھنا، روزہ[۳] رکھنا، زکوٰۃ[۴] دینا، اور حج[۵] کرنا، پہلی چیز مین عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے، اور بقیہ چار چیزین ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کامون کو محیط ہین، انہی ستونون پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے،

اس تقریر کا مفہوم یہ نہین ہے کہ یہ چارون فرض عبادتین نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہین ہین

لہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان،

بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چارون عبادتین اپنے تمام جزئیات باب، اور محتویات کے ساتھ فرض ہین، جو شخص صرف ان چارون فرائض کو جو عنوان باب مین ادا کرتا ہے، اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے، اسکی عبادت ناقص اور اسکی اطاعت نامکمل ہو، اور اُس کے لئے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جسکا خداے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہو مشکوک ہے یہین سے یہ شبہہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازین ہم کو برائیون سے کیون باز نہین رکھتین ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیون نہین بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلون کو پاک و صاف کیون نہین کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہون کی مغفرت کا باعث کیون نہین بنتا، اور قرن اوّل کی طرح ہماری نمازین ملکون کو فتح اور ہماری زکوٰتین ہمارے قومی افلاس کو دور کیون نہین کرتین، اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیون نہین لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ، (نور - ۷)

اللہ نے اُن سے جو ایمان رکھتے ہین، اور تمام نیک کام کرتے ہین، یہ وعدہ کیا ہو کہ وہ اُنکو زمین مین خلیفہ بنائیگا،

ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہو،

اسی طرح ان چارون جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کرکے، صرف مندرجۂ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیاے فانی کی بادشاہی کا اہل بنادے، مگر آسمان کی بادشاہت مین اسکو کوئی حصہ نہین ملیگا، اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤن کے پاؤن کے نیچے دونون جہانون کی بادشاہیان رکھدے، اور یہ اُسی وقت ممکن ہو جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کیساتھ سمجھا جائے، جو اسلام کا منشا ہے، اور اسی وسعت کیساتھ اُس کو ادا کیا جائے، جو اسلام کا مطالبہ ہے،

۱؎ سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی صلعم جلد اول صفحہ ۲۵۲ مطبع محمد علی مصر، کلمۃ واحدۃ یعطونیہا، تملکون بہا العرب وتدین بہا العجم،

نماز

أَقِيمُوا الصَّلوٰةَ،

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے، جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست، سب پر یکسان فرض ہے، یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال مین بھی ساقط نہین ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہوکر نہین ادا کر سکتے تو بیٹھکر ادا کرو، اگر اس کی بھی قدرت نہین ہے، تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منھ سے نہین بول سکتے تو اشارون سے ادا کرو[1]، اگر رُک کر نہین پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو[2]، اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اُسی رخ پڑھو[3]،

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤن سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اُس رحمان و رحیم کی یاد، اور اُس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد و ثنا، اور اُس کی یکتائی، اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور مین جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل، اور ہستی کا خلاصہ ہے،

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگون ہونا اس کے حضور مین دعا و فریاد کرنا، اور اس سے مشکلون مین تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیون مین کوئی ساز ہے، جو نامعلوم انگلیون کے چھونے سے بجا رہتا ہے، یہی

---

[1] نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۰۲ بروایت موقوف از دارقطنی، [2] ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب، [3] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب جواز صلاۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر حیث توجہت،

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا فطری جواب ہے، قرآن نے جابجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے، اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو،

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ جھکے، اندرونِ دل کی عرض نیاز کرے، اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوشِ جنون کا علاج ممکن نہیں، وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہیں؟

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں، اسلام میں اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا، پارسیوں میں زمزمہ، اور ہندوؤں میں بھجن ہیں، اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے، اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان اصول میں سے ہے، جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں، قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو، اور اس کی تاکید نہ کی ہو، خصوصاً ملتِ ابراہیمی میں اسکی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے، حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اسکی غرض یہ بتاتے ہیں کہ "رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ" (ابراهیم) اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کریں" حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں، کہ "رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" "اے میرے پروردگار! مجھکو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا

لہ قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لئے اصطلاحی لفظ "خدا کا نام لینا" تھا، چنانچہ توراۃ اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا، (پیدائش ۱۲-۴) حضرت اسحٰقؑ نے خدا کا نام لیا، (پیدائش ۲۶-۲۵) حضرت داؤدؑ نے خدا کا نام لیا، (زبور ۱۷-۱۶) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے، وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى (الاعلیٰ) اور اپنے رب کا نام لیا، پس نماز پڑھی" اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں مثلاً سفرِ دانیال وغیرہ، اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کیلئے "دعا" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عربی لفظ "صلوٰۃ" کے ہم معنی ہے، اسی لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اسکا ترجمہ نماز کیا ہے، (متی ۶-۱۷-۲۱) اور (متی ۲۳-۱۴)،

بنا" حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے" وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ" (مریم) اور وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے" حضرت شعیبؑ کو اُن کے ہم قوم طعنہ دیتے ہین، اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا" (هود-۸) "کیا تمھاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہین اُس کو چھوڑ دین" حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور اُن کی نسل کے پیغمبرون کے متعلق قرآن کا بیان ہے، وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ (انبیا-۵) "اور ہم نے اُن کو نیک کامون کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی" حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہین "يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ" (لقمان-۲) اے میرے بیٹے نماز کھڑی کر" حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا" وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، (طٰہٰ-۱) "اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر" حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور اُن کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، (یونس-۹) "اور نماز کھڑی کیا کرو" بنی اسرائیل سے وعدہ تھا" اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ" (مائدہ-۳) "مین تمھارے ساتھ ہون اگر تم نماز کھڑی کیا کرو" حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے" وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ" (آل عمران-۴) وہ محراب مین کھڑے نماز پڑھ رہے تھے" حضرت عیسیٰؑ کہتے ہین، وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ (مریم-۲) "اور خدا نے مجھکو نماز کا حکم دیا"

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ مین بھی عرب مین بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (آل عمران-۱۲)

اہل کتاب مین کچھ لوگ ایسے بھی ہین جو راتون کو کھڑے ہوکر خدا کی آیتین پڑھتے ہین، اور وہ سجدہ کرتے ہین،

حدیث مین بھی یہودیون اور عیسائیون کی نماز کے تذکرے ہین، مثلاً آپ نے فرمایا کہ "جب نماز پڑھو تو تہبند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو، یہودیون کی طرح ننگے نہ پڑھو" (صفحہ ۱۲۷) "تم یہودیون کی طرح صرف اوپر سے نماز مین چادر مت ڈال لو، بلکہ اس کو باندھ لیا کرو" (صفحہ ۱۲۳) "نماز مین یہودیون کی طرح مت جھومو" (صفحہ ۱۱۲) "تم یہودیون کے برخلاف نماز مین موزے اور جوتے پہنے رہو" (صفحہ ۱۱۴) "میری امت مین اُسوقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہیگا، جب تک لوگ یہودیون کی تقلید مین مغرب کی نماز مین ستارون کے نکلنے کا اور عیسائیون کی تقلید مین صبح کی نماز مین ستارون کے ڈوبنے کا انتظار نہ کرینگے" (صفحہ ۸۴) ان حوالون[1]

[1] کنز العمال جلد چہارم طبع حیدرآباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثین نقل کیگئی ہین، اور ہم نے اس جلد کے صرف صفحات لکھدیئے گئے ہین،

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ مین کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے،

عرب مین جو لوگ اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان مین بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقۂ عبادت سے واقف نہ تھے، چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گذر چکا ہے، کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "اے خدا مجھے معلوم نہین کہ مین تجھکو کیسے پوجون" یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اُسی پر سجدہ کر لیتے تھے[1] لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے، کسی نے اُن سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے، کہنے لگے جدھر رخ کر لیا[2]، عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے[3]،

وادرکن اعجازاً من اللیل بعد ما　　اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

(اور ان سواریون نے رات کے پچھلے حصہ مین اسوقت کے بعد جب عبادت گذار حنیفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب مین مذہب حنیفی کے پیرو پچھلی رات مین نماز ادا کرتے تھے،

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا، اور اُن کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بنکر رہ گئی تھی، اور نماز سے زیادہ انھون نے قربانی اور نذرانون پر زور دیا تھا جنمین خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا، عیسائیون نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانون کی نماز بھی شروع کر دی تھین، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سیکڑون ولیون اور شہیدون کی عبادت مین مصروف ہو گئے تھے[4]،

دینِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اس کی شکل و صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی اُن کے صحیفون مین اسکی اصلی شکل نظر نہین آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفون کے حال

۱؎ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل ۱۲ ۲؎ صحیح مسلم فضائل ابی ذر ۱۲ ۳؎ لسان العرب لفظ حنف ۱۲ ۴؎ دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت ("ورشپ") ۱۲

اور امانت دار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤن کو پڑھتے تھے، اور اسکی ادائگی کے کیا اوقات تھے، جو کچھ ان مین رہ گیا تھا، وہ صرف علی رسم ورواج، اور بعد کے مذہبی مقتداؤن کی کچھ تجویزین، جنپر مذہبی فریضہ سمجھکر عمل کیا جارہا تھا بجز جو نماز کی روح اور نیاز الٰہی کی انتہائی منزل ہے، اس کو یہود و نصاریٰ دونون نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھکر چھوڑ دیا تھا، اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل وصورت بھی انھون نے بگاڑ دی تھی، قرآن مجید مین اُن کی اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا گیا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَأْخُذُوْهُ ۚ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۗ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۗ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ، وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۗ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ،

(اعراف ۲۱)

ان کے بعد اُنکے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادون سے وراثت مین ملی، وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہین، اور کہتے ہین کہ ہم کو معاف کردیا جائیگا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آئے تو لے لین (اور مذہب کی پروا نہ کرین) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہین لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہین گے اور ان لوگون نے جو کچھ اس (کتاب) مین ہے اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگون کے لیے ہے، جو پرہیزگار ہین کیا تم نہین سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑین اور انھون نے نماز کو قائم کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنے والون کی مزدوری کو برباد نہین کرتے

سورہ مریم مین تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ، (مریم-۴)

ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنھون نے نماز کو برباد کردیا، اور اپنی خواہشون کی پیروی کی،

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود، نماز کو صرف چھوڑ دینا نہین ہے، بلکہ زیادہ تر اُس کی حقیقت اور اس کی روح

کو گم کر دیا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے تھے، تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ اُن کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اسکو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں،

وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا — اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنسی کھیل

وَّلَعِبًا ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ۔ (مائدہ ۹) — بنا لیتے ہیں، یہ اسلیے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں،

اہلِ عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو اُن میں بھی بتوں کے نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے، موحدانہ خضوع و خشوع کا اُن کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا، مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، ڈھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ اُن کے متعلق قرآن نے کہا،

وَمَا کَانَ صَلَاتُھُمْ عِنْدَ الْبَیْتِ اِلَّا مُکَآءً وَّتَصْدِیَۃً (انفال) — اور اُن کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے،

اگلے مفسروں نے اس آیتِ پاک کے دو مطلب لئے ہیں، ایک یہ کہ واقعۃً وہ جو نماز پڑھتے تھے، اُس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر اُن کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے، اور گویا یہی اُن کی نماز تھی[1]، پہلے معنی کی بنا پر تو اُن کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو و لعب تھا، اور دوسرے معنی کے رو سے سرے سے اُن کے ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا ہی ان کی نماز تھی،

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور ۹۵ (ایضاً)

ایک اور آیت میں ہے،

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی، (علق ۱۰) — کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صحنِ حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بیفکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے، کبھی آپ کی گردن میں پھندا

ڈال دیتے[1]، اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشت مبارک پر نجاست لاکر ڈالدیتے تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بار نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے[2]، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے آغاز میں تو اخفاء کے خیال سے اور اس کے بعد اُن کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ میں چھپکر نماز پڑھا کرتے تھے، اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے، یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے مشرکین اگر کبھی اس حالت میں اُن کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن اسحٰق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپکر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعد بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آگئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو بُرا بھلا کہا، اور اُن سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی[3]،

الغرض جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازیں باہم اخلاص واثر، سکون و دلجمعی، خشوع وخضوع، اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کیساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور اُن کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی اُن کے ہاں شرک کا مظہر بنگئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنھوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا، اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا، وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے،

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا، وہ نماز کا تھا، یَا اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ، وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ، (مدثر-۱) "اے لحاف میں لپٹنے ہوئے اٹھ، اور ہشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول" "رب کی بڑائی بولنا" ہی نماز کی بنیاد ہے، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتی ہوئی

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ [2] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئا من الاذی۔
[3] سیرۃ ابن ہشام، (ابتداء ما افترض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)

اس نقطہ پر پہنچکر جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے آپنے سونے والون کو جگایا، بھولے ہوون کو بتایا، انجانون کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست کے، سونے چاندی کے، اور اینٹ اور پتھر کے اُن بتون کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، ڈھکیل کر نیچے گرا دیا، صرف ایک خدا کی نماز دنیا مین باقی رکھی، اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدے کو حرام کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا مین ظاہر ہوئی، آپنے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قومون کی نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، موثر دعائین تعلیم کین، عیسائیون کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا، یہودیون کو نماز کے خضوع و خشوع، راز و نیاز، اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا، اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونون کیساتھ ناقابلِ تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ ، (بقرہ ۲-۳۱) نمازون کی نگہداشت کرو،

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونون حیثیتون سے نگہداشت کا حکم ہے، اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

وَهُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ، (انعام-۱۱) اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہین،

الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ . (معارج-۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین،

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُونَ ، (مومنون-۱) اور (کامیاب ہین) وہ جو اپنی نمازون کی نگہداشت کرتے ہین،

خود آنحضرت صلعم کو حکم ہوتا ہے، کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل و عیال کو بھی اسکا حکم دو، اور اس نماز پر جسکا مکہ کے قیام کے زمانہ مین ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو، فرمایا،

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَوٰةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ، (طٰہٰ-۸) اور اپنے گھر والون پر نماز کی تاکید رکھو، اور خود بھی اسکے اوپر جمے (پابند) رہو،

نماز کیسی ہونی چاہئے؟ فرمایا،

وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ ، (بقرہ ۲-۳۱) اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

تعریف کیگئی کہ

اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون) (کامیاب ہین وہ مومن، جو اپنی نماز مین خشوع کرتے ہین)

حکم ہوا کہ

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (اعراف-۷) تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو،

وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا، (اعراف-۷) اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کیساتھ پکارو،

وَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (اعراف-۳) اور خدا کو پکارو اس حال مین کہ تم دین کو اسی کیلئے خالص کرنے والے ہو،

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہی،

اسلام مین نماز کا مرتبہ اسلام سے پہلے بھی دنیا مین کوئی ایسا مذہب نہین آیا جسمین نماز کو اہمیت نہ دیگئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قومون اور وقتون تک محدود تھے، اس لئے اُن کے اندر سے عملاً اسکی اہمیت جاتی رہی، چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب مین آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اسکی حمد و ثنا کو واضح معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہین یعنی کسی مذہب کے پیرو ون بلکہ اُنھون کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایان نہین ہوتی، ورنہ جیسا کہ گذر چکا قرآن کے رو سے تو دنیا مین کوئی ایسا پیغمبر نہین آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہی کہ اسلام کے سوا وہ کہین نمایان، واضح اور مؤکد صورت مین باقی نہین رہی ہی اور اسکا سبب یہ ہی کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیا، اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فریضۂ الٰہی کو دینِ کامل مین ایسی منظم، واضح، مؤکد اور نمایان صورت دیگئی ہی کہ وہ قیامت تک دنیا مین قائم اور باقی رہے،

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جبتک اسمین کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے کسی حالت مین بھی سبکدوش نہین ہو سکتا، قرآن پاک مین سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجاآوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہی، اس کے ادا کرنے مین سستی اور کاہلی نفاق کی علامت[1]، اور اُسکا ترک کفر کی نشانی[2] بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا،

[1] منافقین کی صفت مین ہی وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (نساء-۲۱) "جب وہ نماز کو اٹھتے ہین تو سستی کاہل ہو کر اٹھتے ہین"

اور اُس کی تکمیل اُس شبستانِ قُدس میں ہوئی جسکو معراج کہتے ہیں[۱۵]،

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اُس کے لوازم ہیں، اور اُس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے چنانچہ سورۂ روم (رکوع ۴) میں پہلا حکم یہ دیا گیا کہ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ط فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، (اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہوا

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، (روم۴) اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ،

اس آیتِ پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے، اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں، خود اُس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلعم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے، اور اُس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے،

چنانچہ آپنے فرمایا کہ "نماز دین کا ستون ہے" جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے، طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آکر صلح کی بات چیت شروع کی، تو نماز، جہاد، اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا، آپ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا، لیکن نماز کے متعلق فرمایا، "جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو، اُس میں کوئی بھلائی نہیں" آپنے یہ بھی فرمایا ہے، کہ "نماز دل کی روشنی ہے"، اپنی نسبت فرمایا ہے، "نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے" ایک تمثیل میں آپنے فرمایا، "انسان آگ میں جلتا رہتا ہے، اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے" یہ محبوبِ ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے، اور نماز آبِ زلال ہے، جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ نے فرمایا کہ "کفر اور ایمان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶) فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ، (ماعون-۱) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں،

[۱۴] کفار کے بارے میں ہے، لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ، (مدثر-۲) ہم نمازیوں میں نہ تھے" یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو،

[۱۵] کتب صحاح واقعات معراج و اسراء، و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ،

درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے؛ کیونکہ ایمان اور کفر دونون انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہین، جبکا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہوسکتا ہے، مسلمان کا وہ عمل جسکے دیکھنے کا دن مین متعدد دفعہ لوگون کو موقع ملے نماز ہی ہے، عین اسوقت جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبانِ مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ فرما رہے تھے "نماز اور غلام[1]"؛

نماز کی حقیقت نماز کے لیے اصل عربی لفظ "صلوٰۃ" ہے، صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانون مین "دعا" کے ہین، اس لئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے، اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ بن حکم سلمی ایک نو مسلم صحابی تھے، ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان مین ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب مین تم یرحمک اللہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز با جماعت ہو رہی تھی، معاویہؓ بھی اُسمین شریک تھے، اُن کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انھون نے نماز کی حالت مین یرحمک اللہ کہدیا، صحابہؓ نے ان کو گھورنا شروع کیا، معاویہ نے نماز ہی مین کہا، تم سب مجھے کیون گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے، نماز ہو چکی تو آنحضرت صلعم نے پوچھا کہ نماز مین کون باتین کرتا تھا، لوگون نے معاویہؓ کی طرف اشارہ کیا، آپ نے اُن کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ "نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے، اس مین انسان کو باتین کرنا مناسب نہین[2]" حضرت انسؓ کہتے ہین کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ الدعاء مخ العبادۃ "دعا عبادت کا مغز ہے" اور حضرت نعمان بن بشیر انصاری روایت کرتے ہین کہ آپ نے فرمایا "الدعاء ھو العبادۃ" "دعا ہی عبادت ہے"[3]، اس کے بعد آپ نے یہ کہکر کہ تمھارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید مین یہ آیت پڑھی جسمین دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے،

---

[1] یہ تمام حدیثین کنز العمال (کتاب الصلوٰۃ جلد ۴) مین مختلف کتب حدیث کے حوالون سے درج ہین، [2] سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوٰۃ یہ دو روایتین ہین ہم نے ان دونون کو جمع کر دیا ہے، [3] یہ دونون حدیثین جامع ترمذی کتاب الدعوات مین ہین، دوسری حدیث ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب الدعاء مین اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء مین بھی ہے،

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (مؤمن-۶) مجھ سے دعا مانگو، میں قبول کرونگا، جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب جہنم میں جائینگے

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ نے فرمایا "بہترین عبادت دعا ہے"۔ اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی، قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کیگئی ہے، یعنی "خدا کی یاد" فرمایا،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ، (طٰہٰ-۱) اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر،

کامیابی اسی کے لیئے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی، وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی (اعلیٰ-۱) کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی، اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی،

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بےچینی، قلبی اضطراب، اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر واماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز، اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے، تو سکون و اطمینان کی راحت اسکو صرف اُسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا، اور التجا میں ملتی ہے، وحی الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا،

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ، (رعد-۴) ہاں، خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارۂ کار بنتے ہیں،

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ، (بقرہ-۵) ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو،

زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر و توانا کے سامنے سرنگون ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کی بیچون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی اُن کی تسبیح و نماز ہے،

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں، مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی

تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط (بنی اسرائیل - ۵)
تسبیح پڑھتی ہے، البتہ تم انکی تسبیح سمجھتے نہیں ہو،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ
وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ
النَّاسِ ط وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ط (حج)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانون مین ہے، اور جو زمین مین ہے
اور سورج، چاند، تارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے
آدمی اس کو سجدہ کرتے ہین، اور بہت سے آدمیون پر اس
کا عذاب ثابت ہو چکا (کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثنا خدا کے سامنے سرنگون ہے، لیکن استثنا ہے تو صرف انسان ہین کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہین، اور بہتیرے اس سے روگردان ہین، اسی لئے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے، انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثنا، اطاعت گذار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام مین مصروف ہے، اور قیامت تک مصروف رہیگی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہی سرکش اور باغی انسانون کو دوسری مطیع و فرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت و انقیاد اور بندگی و سرافگندگی کی دعوت دیتی ہے، جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیون مین خدا کی حمد وثنا اور تسبیح و تہلیل مین مصروف ہے، تو انسان کیون نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے، اور یہی نماز ہے،

نماز کی روحانی غرض و غایت

نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالق کل، رازق عالم، مالک الملک منعم اعظم کی غایت بخششون، اور بے پایان احسانون کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کرین، تاکہ نفس، روح اور دل و دماغ پر اسکی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اوسکی محبت کا نشہ رگ رگ مین سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت مین اسطرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھون کو اپنی طرف اوٹھا ہوا دیکھین جس سے اپنے برے ارادون پر شرمائین، اور ناپاک کامون کو کرتے ہوئے جھجکین، اور بالآخر ان سے بالکل باز آئین، صحیحین کی کتاب الایمان مین ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے مجمع مین تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت مین آکر نماز کی حقیقت دریافت کی، آپ نے اس کی

تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے" اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ "نماز کی حالت مین کوئی شخص سامنے نہ تھوکے، کیونکہ اوس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتون مین مصروف ہوتا ہے[۱]"، حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف مین بیٹھے تھے، اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا "لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز مین ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ[۲]" ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہین، اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے قرآن پاک مین اس نکتہ کی شرح اس طرح کیگئی،

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ط اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (عنکبوت ۵)

اور نماز کھڑی کیا کر، کہ نماز بیحیائی اور برائی کی باتون سے روکتی ہے، اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے،

اس آیت مین نماز کی دو حکمتین بیان کیگئی ہین، ایک تو یہ کہ نماز برائیون اور بیحیائیون سے روکتی ہے، اور دوسری اس سے بڑھکر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے، اور خدا کی یاد سے بڑھکر کوئی بات نہین، بے حیائی اور برائی کی باتون سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے، جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ)

کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے،

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ

تو انہین کو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الصلوٰة، باب البزاق فی الصلوٰة، صحیح مسلم باب المساجد، مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۴ ، ۲ و جلد ۳ صفحہ ۱۷۶ و صفحہ ۱۸۰ وغیرہ [۲] مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۶ و صفحہ ۱۲۹

وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ط وَمَنْ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ ط وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ۝ (فاطر-۳)

سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں، اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لئے حاصل کرتا ہے، اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اُسکی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی، اور اُس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا،

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝ الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِہِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ (معارج-۱)

بیشک انسان بے صبرا بنا ہے، جب اُس پر مصیبت آئے تو گھبرا اُٹھا، اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل، لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں،

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے، نماز کے انہیں ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہو، جسمیں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اُس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی نہیں یارسول اللہ، ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو[1]، ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]،

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ط اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ ۝ (ھود-۱۰)

اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کو،

---

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کیساتھ آئی ہے، کنزالعمال (جلد ۴ صفحہ ۶۰۷ و ۶۰۹) میں حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں، [2] صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ وتفسیر سورۂ ہود،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیروؤن مین جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہو، اُن کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہو یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گرجانے سے پوری عمارت کا گرجانا یقینی ہو،

نماز کے لئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہین جنکی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہین، اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ "نفسیات یا دماغی کیفیات" کہتا ہے، اس کے لئے بھی کچھ قانون اور اسباب ہین جنکی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس وروح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور اُن کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہین، سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے، اُس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسرون کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہین، اور اُن کے مناسب شکل وصورت، اور ماحول (گرد وپیش) نہ اختیار کرین، تو ہم کو اُن کے پیدا کرنے مین کامیابی نہین ہوسکتی، ہمارے تمام تمدنی، اجتماعی، اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت مین وضع ہوئے ہین اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی، اور اجتماعی، مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم وآداب اور قواعد وضوابط مقرر ہین، معبدون ہیکلون اور گرجون مین جہان مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے پجاریون اور کاہنون کے خاص لباس، خاص رسوم وآداب، سکون وخاموشی، ادب ولحاظ، گھنٹون کی پرشکوہ آواز، اور نشست وبرخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہین، شاہانہ رعب وداب کے اثرات پیدا کرنے کے لئے شاہی جلوسون اور سلطانی دربارون مین فوجون کے پرے، قوی ہیکل چوبدار، عصابردار نقیب وچاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکین، ننگی تلوارین، بلند نیزے، تخت و تاج، علم وپرچم، ماہی مراتب، نوبت ونقارہ اور دمبدم دورباش اور نگاہ روبرو کی پر رعب صدائین ضروری ہین، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لئے فضا کا سکون وخاموشی، مقام کی سادگی وصفائی، شور وغوغا، اور شہر وبازار سے دوری ضروری چیزین ہین، بزم عروسی کے لئے رنگ و بو، نور وسرور، گانا بجانا، اور عیش ونشاط کا اظہار طبعی ہے،

انہی طبعی ونفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال مین بھی ان محرکات وآداب وقوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے

مقصود دل کے خضوع وخشوع، توبہ دانابت پشیمانی وشرمندگی، اطاعت وبندگی، اور خدا کی عظمت وکبریائی، اور اپنی عاجزی ودرماندگی کا اظہار نیز دل ودماغ اور نفس وروح مین پاکی، صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے، اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب وشرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جنسے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو ونما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار مین کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کئے رہے، طور وطریق اور حرکات وسکنات مین ادب واحترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہون، اور سچے اس کی بارگاہ مین اپنی دعاؤن اور التجاؤن کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے، اور اس مین روحانی فیوض وبرکات کی استعداد وصلاحیت پیدا ہوتی ہے، فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی وپاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی وپاکیزگی کا تصور اس کے اندر موثر انداز مین کیونکر پیدا ہوگا یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ مین جاری وساری ہی، اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازون سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازون سے مسجد کی نماز بہتر ہے، کہ جماعت کا حول اور مسجد کا منظر دلون کی کیفیت کو دوبالا کر دیگا، اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کامون مین اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے، اسی اصول کے ماتحت اسکولون کی تنظیم، اور اُن کی درجہ بندی، کھیل مین فریقین کی ہمرنگی وہم لباسی، فوجون مین وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہی، اور یکسان اسلحہ اور ہتھیار، اور ہمقدم سکون ورفتار کی بھی ضرورت ہے، کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت مین چند اشخاص ایسے ہون جو اصلی کیفیت سے متکیف ہون، اُن کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسرون کو بھی پرکیف بناتی ہے، اور ان سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہوکر، کم وبیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے، اسی لئے جلسون مین ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتون کو رونا آجاتا ہے، نفسیات اجتماع مین یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی ونفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے،

ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے

یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود، خضوع و خشوع، ذکر الٰہی، حمد و ثنا، اپنے گناہون پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے، یہ تمام باتین درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہین جن کے لئے ظاہری ارکان کی حاجت نہین ہے، اسی لئے اسلام نے اپنی عبادتون کی دو قسمین کی ہین، ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت مین کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے، اسکا نام عام تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی ہے جسکے لئے نہ زمانہ کی قید ہے، نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت مین انجام پا سکتی ہے، چنانچہ خدا نے فرمایا،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (نساء ۱۵) پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے، اور لیٹے، یاد کرو،

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابۂ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران - ۲۰) جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہین،

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہین کرتے، فرمایا،

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور - ۵) ایسے لوگ ہین جنکو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہین کرتے،

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے،

دوسری عبادت وہ ہے، جو خاص شکل و صورت کیساتھ خاص اوقات ہین اور خاص دعاؤن کے ذریعہ سے ادا کیجائے، اس کا نام نماز ہے، پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے، اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے، اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہین ہے، اور نہ اسلام مین اسکو جماعت کیساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے، جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے، کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے، لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے، اور اسی لئے اس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے، اگر اس کو جماعت کیساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائیگی،

لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہیگی، دوسرے لفظون مین ہم اسکو یون تعبیر کر سکتے ہین کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل انفرادی طریقۂ عبادت ہے، اور نماز ایک جماعتی شعار ہے، جو خاص ارکان اور شرائط کیساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے، اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت مین حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کیساتھ ادا نہ ہوسکے تو تنہا بھی اسکو ادا کرنا ضروری ہے، اس کی مثال اُس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل مین اپنی فوج سے جس کے ساتھ اُسکو چلنا تھا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا، اب تنہا رہ کر بھی اسکو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا،

نماز مین نظام وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے، وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سر الاسرار ہے،

اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ "توحید" ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے، جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے، نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہئے، اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت، آئین و طریق، اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتین اس کو ایک متحدہ نظام مین، ادا نہین کر سکتی تھین، نماز لاکھون کرورون مسلمانون پر جنھون نے دعوت محمدی کو قبول کیا فرض تھی، اب اگر ان مین سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی، کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر منھ کر کے چاہے ادا کرے، تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا، اور نہ اس کے دل کیطرح اس کی جسمانی اداؤن سے بھی توحید کا راز آشکارا ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھون کرورون مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے،

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا، توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے، اور کرورون و لاکھون کو جو کرورون اشباح و اجسام مین ہین، ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اُن سے واحد نظام کے ماتحت واحد

صورت و شکل مین، واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام اجتماعی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے، قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے، اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے،

نماز مین جسمانی حرکات | یہ بھی ظاہر ہے، کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اُس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت مین چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف مین زرد پڑ جاتا ہے، خوشی مین کھل اٹھتا ہے، غم مین سکڑ جاتا ہے، جب کسی سے سوال کرتا ہے، تو اس کے سامنے اپنے دونون ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے، تو اس کو دیکھکر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اُس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروتنی، اور خوشامد مقصود ہو تو منھ کے بل گرتا ہے اور پاؤن پر سر رکھدیتا ہے، یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہین، جو ہر قوم مین تقریبا یکسان رائج ہین، اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح نماز کی دعائین انسانی طرز بیان مین ادا کی گئی ہین، اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت مین رکھے گئے ہین،

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اُس کے جسمانی اعضا ہین، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اُسوقت تک کچھ نہین کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤن اور زبان سے اُن کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعوی کر سکتا ہے، اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہین کر سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے، اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے، جس طرح باہر کی، اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہین، مگر خود بندون کو ان کی ضرورت ہے، کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونون حیثیتون سے عرض و التجا، اور تذلل و عاجزی کی تصویر بنجائین،

انسان اپنے جسم اور روح دونون کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے، اس کی زندگی کے دونون جزء خدا کے احسانات و

انعامات سے یکسان گران بار ہین، اس لئے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے رُوح اور جسم دونون جھک کر سجدۂ نیاز ادا کرین، غرض یہ وجوہ ہین جنکی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونون کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کئے،

اوپر گذر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب مین نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے، جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اُس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقون سے کرتے ہین، کھڑے ہو جاتے ہین، جھک جاتے ہین، زمین پر سر رکھدیتے ہین، نماز کے بھی یہی تین رُکن ہین چنانچہ آغازِ عالم سے انبیائے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانون کو دی، وہ انہین تین اجزا سے مرکب تھی، کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھدینا (سجدہ)

ارکانِ نماز

معلوم ہو چکا ہے کہ "نماز" ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اسکی غرض بھی بتائی گئی،

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُودِ ، (حج-۴)

اور میرے گھر کو طواف کرنے والون، کھڑے ہونے والون رکوع کرنے والون، اور سجدہ کرنے والون کیلئے پاک و صاف کر،

اس حکم مین نماز کے تینون ارکان، قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، اُن کو خطاب ہوا،

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ، (آل عمران-۵)

اے مریم اپنے رب کے حضور مین کھڑے ہو کر بندگی کر، اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والون کیساتھ رکوع کر،

اس نمازِ مریمی مین بھی، نماز کے تینون ارکان موجود ہین،

تورات کے حوالون سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ مترجمون نے عبرانی اور یونانی لفظون کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیئے ہین، جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے، بہرحال عبادت و تعظیم کے یہ تینون طریقے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور اُن کی نسل مین جاری تھے، ذیل مین

ہم ان مین سے ہر ایک کا حوالہ توراۃ کے مجموعہ سے نقل کرتے ہین،

قیام	"پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور مین کھڑا رہا" (پیدایش ۱۸ - ۲۲)
رکوع	"اور (ابراہیم) زمین تک اُن کے آگے جھکا، اور بولا اے خداوند" (پیدایش ۱۸ - ۲)
سجدہ	"اور یہ سُن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبرگیری کی، اور اُن کے دکھون پر نظر کی، انھون نے اپنے سر جھکائے، اور سجدے کئے" (خروج ۴ - ۳۱)

"تب ابرہام (ابراہیم) منہ کے بل گرا، اور خدا اُس سے ہمکلام ہوکر بولا، (پیدایش ۱۷ - ۳)

"تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے جوانون سے کہا تم یہان گدھے پاس رہو، مین اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہان تک جاؤن گا، اور سجدہ کرکے پھر تمہارے پاس آؤنگا" (پیدایش ۲۲ - ۵)

"تب اُس مرد (حضرت اسحاقؑ کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہو، (پیدایش ۲۴ - ۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا، جہان اس نے خدا کو سجدہ کیا" (۲ سموئل ۱۵ - ۳۲)

زبور مین حضرت داؤد خدا تعالیٰ سے کہتے ہین :-

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کیطرف تجھے سجدہ کرون گا" (زبور ۵ - ۷)

ان حوالون سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت مین عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینون ارکان موجود تھے، اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل مین دعا و نماز کا ذکر متی ۶ - ۵ و ۱۷ - ۲۱ و ۲۶ - ۳۶ مرقس ۱۴ - ۳۲ و لوقا ۲۲ - ۴۱ وغیرہ مین ہے، طریقہ نماز مین ایک انجیل مین ایک ہی موقع کے لئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲ - ۴۱) اور دوسری مین (متی ۲۶ - ۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے، اور بقیہ انجیلون مین خاموشی ہے،

عہد بعثت مین یہود و نصاریٰ مین جو لوگ نماز کے پابند تھے، وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہوکر توراۃ یا زبور کی آیتین تلاوت کرتے تھے، اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآن پاک کی شہادت ہے،

لَيْسُوْا سَوَآءً، مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (آل عمران - ۱۲)

وہ برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں،

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کیطرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں[۱]، اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے،

اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کیساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آرہی تھی، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے"[۵۲]

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا، انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو اُبھار دیا، نماز کے بیجان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا، اس کو دین کا ستون بنایا، اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اسکی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا، اس طرح اس نے اُس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لئے وہ ازل سے منتخب تھا،

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ صلعم اور صحابہ کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے، خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے، اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے، تو نماز کو اُس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے،

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ، فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا، فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا

نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو، اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو

---

[۵۱] فتح الباری ابن حجر جلد ۲ صفحہ ۲۲۶ مصر، [۵۲] مضمون صلٰوۃ جلد ۴ صفحہ ۹۶،

عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ، — جیسے اُس نے تم کو بتایا جو تم نہین جانتے تھے ،

(بقرہ - ۳۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس ذکر الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا، جسکی عملی شکل نماز ہے، اور اسی کی تفصیل سورۂ نساء مین ہے، اسی طرح جنگ کی نماز مین ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد، دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے،

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۚ (نساء - ۱۵)

پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلوون پر یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو،

اس آیت مین غور کرنے کی دو باتین ہین، اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی، اسکو الصلوٰۃ (نماز) کہا گیا، اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھکر بیٹھکر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت مین پوری ہوئی اسکو صرف "ذکر اللہ" کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو "اقامت صلوٰۃ" (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہین کیا گیا، حالانکہ ذکر الٰہی، تسبیح و تہلیل، اور بعض ارکان بھی اسمین موجود تھے، بلکہ یہ فرمایا گیا کہ (پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو) اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہین، یعنی اقامت صلوٰۃ کے ضمن مین ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قرأت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہین، جو جنگ کی حالت مین کم یا موقوف ہو گئے تھے، اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز مین اُنکی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورۂ بقرہ مین یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اوس طرح یاد کرو جس طرح اُس نے بتایا ہے،

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام مین نماز کن ارکان کیساتھ مقرر ہوئی ہے، گو اس کے لئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت صلعم نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی، اور صحابہ کو کس طرح کی نماز سکھائی، کیونکہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اُس عہد سے لیکر آج تک موجود ہے، اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے، اور اسلام کے ہر فرقہ مین یکسان طور

عملاً بلا اختلاف مسلم ہے، تاہم نظریہ پسند لوگون کے لئے قرآنِ پاک سے انکا ثبوت بہم پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا،

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ مین مؤدب کھڑے ہوتے ہین،

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ق — نمازون پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو،

وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ، (بقرہ ۴-۳۱) — اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو،

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہین کہ

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ (اعلیٰ-۱) — اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ، (مدثر-۱) — اور اپنے رب کی بڑائی کر،

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز مین بار بار تکرار کیجاتی ہے، اسی حکم کی تعمیل ہے،

اس کے بعد خدا کی حمد وثنا کرتے، اور اُس سے اپنے گناہون کی بخشش چاہتے ہین،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ (طور ۲-۳) — اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر،

پھر قرآن پڑھتے ہین،

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ (مزمل-۲) — قرآن مین سے جتنا ہوسکے پڑھو،

قرآن کی ان آیتون مین خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہین، اور اس کی حمد خصوصیت کیساتھ بیان کرتے ہین،

جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا — کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہکر پکارو، سب اچھے

تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ — نام اسی کے ہین، اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ، اور نہ

وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا — بہت چپکے، بیچ کی راہ تلاش کر، اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ — جس نے کوئی بیٹا نہین بنایا، اور نہ سلطنت مین کوئی

يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ — اُسکا شریک ہے، اور نہ درماندگی کے سبب سے اوس کا

وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۔ (اسرائیل ۔۱۲) کوئی مددگار ہے، اور اسکی بڑائی کر، بڑی بڑائی،

چونکہ اس کی یہ حمد سورہ فاتحہ میں بہ تمام وکمال مذکور ہے، اسی لئے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں، اس کے بعد قرآن میں سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اُس کو پڑھتے ہیں، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے ہیں یعنی رکوع کرتے ہیں

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۔ (بقرہ ۔۵) اور رکوع کرنے والوں کیساتھ رکوع کرو،

پھر اس کے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَ اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے

اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ رب کی پرستش کرو، اور نیک کام کرو، تاکہ کامیاب

تُفْلِحُوْنَ ۔ (حج ۔۱۰) ہو،

ان دونوں (رکوع وسجدہ) میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں،

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۔ (واقعہ ۔۲۔۳) تو اپنے بزرگ پروردگار (ربِ عظیم) کے نام کی تسبیح کر،

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۔ (اعلیٰ ۔۱) اپنے برتر رب (ربِ اعلیٰ) کے نام کی تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کی زبانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے[1]،

قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب، سورۂ حج (۱۰۔ ذکر ابراہیم) اور آل عمران (۵۔ ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ہی ایک رکعت تمام ہوجاتی ہے، سورۂ نساء (۱۵۔ ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے، درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے، تعظیم کی ابتدائی اور کمتر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہوجاتا ہے، جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے، اور جب فرطِ بےخودی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور منعم کے پست ترین حصۂ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے، قرآن

[1] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الرکوع والسجود،

نے کہا ہے،

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ، (علق-۱) اور سجدہ کر اور قریب ہو جا،

گویا سجدہ قربت الٰہی کی اخیر منزل ہے، شاید اسی لئے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے،

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے،

قرآن پاک کی مختلف آیتون مین ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتون کا حکم دیا گیا ہے، جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے پھر جھکانے، اور سرنگون کرنے کا حکم ہے، مختلف دعاؤن کے پڑھنے کی تاکید ہے، خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے، رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لئے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتون کے احکام یکجا ہو گئے، اسی لئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگون جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے، دوسرے لفظون مین یون کہہ سکتے ہین کہ قرآن پاک مین مسلمانون کو قیام، رکوع، سجود و تہلیل تسبیح، تکبیر قرأت قرآن، ذکر الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کئے گئے ہین، ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے، جس مین یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہین، دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری مین ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے، کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانون کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا، کہ جو چاہے، رکوع کرے، جو چاہے سجدہ کرلے، جو چاہے صرف قیام کرے جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قرأت پر اکتفا کرلے، اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کرکے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرائض الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جنپر کبھی عمل نہ ہوتا، اور عجب نہین کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل مین مانع آتی سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانون کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی، نہ جماعت ہو سکتی، اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جا سکتا، اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اُس سے پیدا ہو کر مسلمانون کو واحد امت بناتی اور بتاتی،

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی[1] اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت

---

[1] مؤطا امام مالک و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ،

نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا، اور اس پورے تواتر عمل کے ساتھ جس مین ذرا بھی شک و شبہہ نہین، وہ آج تک محفوظ ہے،

نماز کی دعا | نماز کی مختلف حالتون مین اُن حالتون کے مطابق مختلف دعائین پڑھی جاتی ہین، اور پڑھی جاسکتی ہین، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی مختلف حالتون کی بیسیون مختلف دعائیں مروی ہین، اور ہر مسلمان ان مین سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے، لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، جس کے نماز مین پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت مین پڑھا ہے، اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہین، وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لئے وہ اسلام مین نماز کی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہو جو خدا نے بندون کی بولی مین اپنے منھ سے ادا کی،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ	حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانون کا پروردگار ہو
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۭ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ	رحم والا مہربان ہے، ہمارے عمل کے بدلے کے
نَسْتَعِيْنُ ۭ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ	دن کا مالک، (ہے) (اے آقا!) ہم تجھی کو پوجتے
صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ	ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہین، تو ہم کو سیدھا راستہ
الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ ۧ	چلا، ان کا راستہ جنپر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ
(فاتحہ-۱)	نہین جنپر غضب آیا، اور نہ انکا جو بہک گئے

(اس دعا کو ختم کرکے آمین کہتے ہین، یعنی اے خدا تو اسکو قبول کر،)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان، ہر نماز مین دہراتا ہے جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہو[۱]، یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستایش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا

---

[۱] جامع ترمذی قرأت فاتحہ،

یقین ہے، عبادت کے مُخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھون کی تقلید کی آرزو اور بُرون کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے، جس وقت اس حمد مین خدا کی پہلی صفت "کل جہانون کا پروردگار" زبان پر آتی ہے، تو اُس کی تمام قدرتین اور بخششین جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہین سب سامنے آجاتی ہین، "جہانون" کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے، "سارے جہانون کے ایک ہی پروردگار" کے تصور سے کل کائناتِ ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن مین آتا ہے، انسان ہون کہ حیوان، چرند ہون کہ پرند، پھر انسانون مین امیر ہون یا غریب، مخدوم ہون یا خادم، بادشاہ ہون یا گدا، کالے ہون یا گورے، عرب ہون یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکسان معلوم ہوتی ہے، خدا کو "رحمان و رحیم" کہکر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایان شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابلِ بیان کیفِ محبت کا سمندر دل کے کوزہ مین موجین مارنے لگتا ہے، "روز جزا کے مالک" کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر، اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے، "ہم تجھی کو پوجتے ہین" کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دیتے ہین، "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہین" بول کر ہم تمام دنیاوی سہارون اور بھروسون کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتے، اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیاز مند بنجاتے ہین، سب سے آخر، ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہین، یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہین۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا	کہدے (اے پیغمبر) آؤ مین تم کو پڑھ کر سناؤن
تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج	جو تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اُس کیساتھ
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ	شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت
نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ	کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ج وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ	ان کو روزی دیتے ہین، بے حیائی کی باتون کے

الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ
بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ
الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ
اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا
قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ
بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ
مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ

(انعام - ۱۹)

نزدیک نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہیں (فحش) ہوں یا
باطن ہیں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو
مت مارو، لیکن انصاف کیساتھ، یہ وہ باتیں ہیں
جنکا حکم خدا نے تم کو دیا ہے، شاید کہ تم سمجھو، اور یتیم
کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے،
یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے، اور ناپ
اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس
کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے، جب تم بات
بولو تو انصاف کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو،
اور خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ وہ باتیں ہیں جنکا خدا نے
تم کو حکم دیا ہے، تاکہ تم نصیحت پکڑو، اور بے شبہ یہی ہے
میرا سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو،

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحیِ محمدی کی اصطلاح میں "صراطِ مستقیم" کیا ہے یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کیساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمانداری، بلا رو رعایت سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفاتِ عالیہ ہیں جن کو "صراطِ مستقیم" کی مختصر سی ترکیبِ توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں،

یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اُس کا فضل و انعام ہوا۔ یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے،

وَمَن يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُوْلٰٓئِكَ مَعَ	اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں، تو وہ اُن
الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ	لوگون کے ساتھ ہین جنپر خدا کا فضل اور انعام ہوا،
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ	یعنی نبی، صدیق، شہید، اور صالح لوگ، ان کی
وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (نسآء-۹)	رفاقت کیسی اچھی ہے،

اس بنا پر ہر نمازی جس صراطِ مستقیم اور راہِ راست کے لئے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے، جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاءؑ، صدیقین، شہداء، اور صالحین) علی قدرِ مراتب چل چکے، سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت مین ہم اپنی طرف سے بدعتون کا اضافہ کرین، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دین، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے، اور ہر قسم کا انعام واکرام چھین لیا جاتا ہے، پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہین، جنھون نے دین مین اپنی طرف سے ہزارون باتین اضافہ کردین، دوسری کا نمونہ یہود ہین، جنھون نے احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا، اور ہر قسم کے انعام واکرام سے محروم ہوگئے، مسلمانون کی دعا یہ ہے، کہ الٰہی ہم کو ان دونون غلط راستون سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا، (سورۂ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤن کی جامع، جسم و روح کی نیکیون پر مشتمل، اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس مین خدا کی حمد بھی ہے، اور بندے کی التجا بھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے اس کی نسبت فرمایا:-

> جو نماز مین اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصون مین بٹی ہوئی ہے، آدھی میرے لئے ہے، اور آدھی اس کے لئے، بندہ جب الحمد للّٰہ رب العلمین (حمد ہو سارے جہانون کے

پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری ستایش کی" پھر جب وہ الرحمٰن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری تعریف کی" ۔ پھر وہ کہتا ہے مالکِ یوم الدین (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی" اتنا میرا حصہ ہے، اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے، کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراطِ مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا"[1]

اس حدیثِ قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اُس دعا کا جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح میں نشاط، اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یورپین فاضل اے جی وینسنک (A.G.WENSINCK) کو بھی جس نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پر معلومات مضمون لکھا ہے، تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"(اسلام کے رو سے) نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے، ایک دفعہ محمدؐ نے ایک پر نقش و نگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے، یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے، اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمدؐ نے کہا ہے، کہ "مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے" محمدؐ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے، نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے، جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں جن میں بیان ہے کہ "نماز

---

[1] جامع ترمذی تفسیر فاتحہ و مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۶۰ (مصر)

خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے"۔ اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے

کہ "سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے"۔[1]

اس دعائے محمدیؐ کا موازنہ دوسرے انبیاؑ کی منصوص دعاؤں سے

دنیا مین کوئی پیغمبر ایسا نہین آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز مین پڑھنے کیلئے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، کوہِ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت حضرت موسیٰؑ نے نماز مین جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج مین موجود ہے، زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس مین ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ "داؤد کی نماز" انجیل مین حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب مین حواریون کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہین، جو آج تک عیسائیون کی نماز کا اصلی جزو ہے، ان دعاؤن کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہؐ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسن تعبیر، جامعیت، پاکیزگی، اور اختصار کا اندازہ ہوگا، اور پتہ چلے گا کہ اسکی کیا بے مثالی ہے جس کے سبب سے نمازون مین پڑھنے کے لئے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابیؓ سے فرمایا تھا کہ "نماز مین جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ مین اتری نہ انجیل مین نہ زبور مین، اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن مین موجود ہے"۔[2] اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤن پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا،

توراۃ کی کتاب الخروج مین ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لئے کوہِ طور پر چڑھے، اور تجلی نظر آئی، تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ مین گر گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ دعا تعلیم کی،

> خداوند خداوند، خدا، رحیم، اور مہربان، قہر مین دھیما اور رحمت اور وفا مین غنی ہزار پشتون کیلئے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا لیکن وہ ہرحال مین معاف نہ کریگا،

[1] یہ حدیث اوپر گزر چکی،
[2] جامع ترمذی فضائل سورۂ فاتحہ،

بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لیگا" (۳۴-۶)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہیں، لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے، پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں بابِ اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے،

زبور میں حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا | زبور باب ۸۶،

داؤد کی نماز

" اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سُن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے، اے خداوند مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں، اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے، اور بخشنے والا ہے، اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں، وافر ہے،

اے خداوند! میری دعا سُن، اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا، کہ تو میری سنیگا، معبودوں کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہیں، اور تیری صنعتیں کہیں نہیں، اے خداوند! ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا، آئینگی، اور تیرے آگے سجدہ کریں گی، اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے، تو ہی اکیلا خدا ہے،

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا میں، تیری سچائی میں چلونگا، میرے دل کو یکطرفہ کر، تاکہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل

سے تیری ستایش کرون گا، اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کرونگا کہ تیری رحمت

مجھ پر بہت ہے، اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دی ہے،

اے خدا، مغرورون نے مجھپر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان

کے پیچھے پڑی ہے، اور انھون نے مجھ کو اپنی آنکھون کے سامنے نہین رکھا، لیکن تو اے خداوند

خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے، اور شفقت اور وفا مین بڑھ کر ہے، میری

طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش، اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو

نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا، تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہین، دیکھین اور

شرمندہ ہون، کیونکہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی"۔

اس دعا مین بھی وہی خدا کی حمد وصفت اور توحید وعبادت کا ذکر، راہِ راست کی ہدایت کی طلب اور شریرون اور گمراہون سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول، تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہین بن سکتی، اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز مین پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے،

انجیل مین نماز کی دعا، حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریون کو دعا، اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہین:۔

"اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے، تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے، تیری

مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور

ہمارے قرض ہمین معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضدارون کو معاف کرتے ہین، اور ہمین

آزمایش مین مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ

تیرا ہی ہے۔" آمین،

نام کی تقدیس" خدا کی حمد" ہے، "بادشاہت کے آنے" سے مقصود شاید قیامت، اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعائے قرآنی میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، کے لفظ سے ادا ہوا ہے، نیز استعارہ کی زبان مین "روز کی روٹی" سے مراد دنیاوی روٹی نہ لیجائے، بلکہ روح کی غذا یا صراطِ مستقیم لیجائے، اور "قرض" سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائین جو خدا کی طرف سے انسانون پر عائد ہین" آزمایش" مین نہ پڑنے اور "برائی" سے بچنے کے معنی وہی لئے جاسکتے ہین، جو اسلامی دعا کے خاتمہ مین مذکور ہے کہ "نہ اُن کا راستہ ہو جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں"،

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چارون دعائین جو چار اولوالعزم پیغمبرون کی زبان نبوت سے ادا ہوئین، کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہین جو تکمیلِ دین کے مختلف مدارج مین کسی کو نظر آسکتی ہے، دعائے محمدیؐ تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لبریز ہے، خدا کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ مین ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت مین ہر انسان کے دل کی نمایندگی کرسکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینون کی لغزش کا باعث ہون اور خدا کو انسانون سے رحم وکرم کی صفت "قرض" لینے پر آمادہ کرتے ہون، نیز وہ خدا کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جسمین کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے، خدا کی وہ تین صفتین جنکا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہین ہوسکتا، (یعنی، ربوبیت، رحمت، اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت مین وہ تمام صفتین داخل ہین، جنکا تعلق پیدایش سے لیکر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے، جس مین اس کی تمام جمالی صفتون کی نیرنگیان ظاہر ہوتی ہین، مالکیت اس کی تمام جلالی صفتون کا مظہر ہے، اور پوری سورہ دعا کے اغراض ثلاثہ حمد، اچھائیون کے لیئے درخواست، اور برائیون سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے، طرز بیان خدا اور بندہ کے شایانِ شان ہے، درخواستین حد درجہ مؤدبانہ ہین، اوصافِ الٰہی وہی ہین جو ایک دعا کے مناسب

ہو سکتے ہین، دعا مین عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہین ہے، للہیت اور روحانیت کا کمال، منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزون کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤن مین کمیت اور کیفیت دونون حیثیتون سے تناسب موجود ہے، یعنی دونون حصون نے مناسبت کیساتھ جگہ گھیری ہے، اور دونون ٹکڑون کے مضامین مین ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت، اور بندہ کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی، کا ایسا جامع، مختصر، اور پر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہان مل سکتا ہے؟

نماز کے لئے تعین اوقات کی ضرورت

نماز کے سلسلہ مین اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقات نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہین ہو سکتا، اس لئے کسی کام کے کرنے کیلئے وقت سے بے نیازی ممکن نہین، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہین، اس نے نماز کی تعلیم دی، تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہین بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات مین اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولاجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کیساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کرے کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہین دے سکتا، اسی لئے ہر منظم، باقاعدہ، اور دائمی عمل کیلئے اوقات کی تعیین ضروری ہے، اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کامون کے لئے اختیار کیا ہے، اس مین اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کی لیے ۲۴ گھنٹون کی مہلت ہے، تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہانتک کہ دن تمام ہو جاتا ہے، اور آخری گھڑی بھی گذرجاتی ہے، اور وہ اس کام کو انجام نہین دیتا، لیکن جب کامون کے لئے اوقات متعین ہو جاتے ہین تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے، اور وہ

وقت گذرنے نہین پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہی اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے جاتے ہین،

اوقاتِ نماز کے تقرر مین وہ چیز بھی مدّ نظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، یعنی اصولِ وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے، مسلمان مختلف شہرون، ملکون، اور اقلیمون مین ہزارون لاکھون اور کرورون کی تعداد مین آباد ہین، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت مین وحدت کا مرقع بنجاتی ہے، کرۂ ہوا مین لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت مین لاکھون کرورون انسانون کو ایک ہی وضع مین ایک ہی شکل مین خالقِ عالم کے سامنے سرنگون پاؤگے، اور جہانتک مطلع و مغرب مین نمایان فرق نہ ہوگا، یہی منظر آنکھون کے سامنے رہیگا، مختلف ملکون مین طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہین ہونے دیتا، تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت مین ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اُسی حالت مین ہوتا ہے، تو نماز کا فرض اس وقت وہان ادا ہوتا ہے، یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ارضی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت مین نظر نہین آسکتے تھے،

نماز کے اوقات دوسرے مذہبون مین

اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبون نے یکسان تسلیم کیا ہی، اور اپنے اپنے نظریون اور اصولون کے مطابق عبادتون کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہین، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہین، زردشتی صرف طلوعِ آفتاب کے وقت زمزمہ خوان ہوتے ہین، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہین، یہودیون مین تین وقت کی نمازین ہین، جنکو "تفلا" کہتے ہین، دانیال نبی کی کتاب مین ہے،

"جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہوگئے تو وہ اپنے گھر آیا، اور اپنی کوٹھری کا دروازہ جو بیت المقدس کیطرف تھا کھول کر اور دن بھر مین تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا

کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکر گذاری (حمد) کرتا رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے" (۶-۱۰ تا ۱۳)

حضرت داؤدؑ کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے،

"پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچا لیگا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کرونگا، اور نالہ کروں گا، سو وہ میری آواز سن لیگا" (۵۵-۱۶ و ۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے؛

"پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا ضرور ہے، ایک تمثیل کہی" (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے، اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز اُن کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے:

"پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا" (اعمال ۱۰-۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے،

پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے" (اعمال ۳-۱)

یونانی میں تیسرے پہر کے بجائے "نویں گھڑی کو" لکھا ہے جسکو ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰-۳۰ میں بھی ہے،

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا، کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے،

"اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا، جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردوں

مین سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ)
نے اپنے شاگردون کو سکھایا، اس نے اُن سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے اُن سے کہا تم مین سے کون ہے جسکا ایک دوست ہو اور وہ
آدھی رات کو اس کے پاس آکے کہے اے دوست مجھے تین روٹی ادھار دے"، (لوقا-۱۱)

اس تمثیل مین حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انھین گرفتار کیا گیا، وہ ایک جماعت کیساتھ اسی نماز تہجد مین مصروف تھے، (لوقا ۲۲-۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل مین موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت مین ہے" اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اُٹھکے نکلا اور ایک ویران جگہ مین گیا اور وہان دعا مانگی"۔ بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے[۲] ہوا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دواماً اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس مین اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے وَفِی الصبح باکرا قام وخرج الی موضع خلاء وکان یصلی هناک، یعنی وہ وہان نماز پڑھا کرتے تھے،

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی مقدس کتابون مین مذکور ہین ہم جمع کرلین، تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائین گے، جنمین سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵-۱۶ و ۱۷) مین، صبح کا مرقس (۱-۳۵) مین، عصر کا اعمال (۳-۱ و ۱۰-۳ و ۳۰) مین ہے، اور عشا، رات کی نماز کا لوقا (۱۱ و ۲۲-۳۹) مین!

نماز کے لئے مناسب فطری اوقات۔

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتون کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز مین مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتون کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات مقرر

---

[۱] مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء [۲] مطبوعہ مطبعہ ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۶۰ء

کر دیئے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے، اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے، اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حیّ علی الصلوٰۃ کا نغمۂ جانفزا سناتی ہے اور ہر شئی کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے، تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لئے بھی نہایت موزوں ہے، کہ کتاب زندگی میں حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اُس وقت کھلتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے، اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں، تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے، جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ اسکا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کے لئے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لیکر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیئے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں،

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہین، اسی لئے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہین رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہین ہے، یہ وقت صرف خواب راحت کے لئے موزون ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمامتر انسان کے کام کے ہین، انھین کام کے اوقات کے شروع مین نماز پنجگانہ مقرر ہوئی ہے،

اسلامی اوقات نماز مین ایک نکتہ،

اوقاتِ نماز کی تعیین مین اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانون کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسد کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہرجگہ سورج کی پرستش کیجاتی تھی، جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قومون مین آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکت نیمروز کو فتح کرکے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہوکر نقابِ شب مین اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے،

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کا چراغ گل کیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ[۱] صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملتِ ابراہیمی مین نماز کے وہ اوقات مقرر کئے گئے، جب ستارہ پرستون کے خداے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہین، بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دین کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اُس خداے برحق کی عبادت ہے، جس کے آستانۂ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دینِ محمدی ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس مین بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی مین تھے،

---

[۱] قرآن پاک سورۂ انعام۔ ۹،

دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم مین روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچکر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی تین دور ہوتے ہین، جب سر (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے جس کو زوال کہتے ہین، جب آنکھون کے دائرۂ تقابل سے نیچے اترتا ہے، جس کو عصر کہتے ہین، اور پھر جب دائرۂ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے، جس کو مغرب کہتے ہین، آفتاب کے ان تینون اوقاتِ انحطاط مین ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر مین مدفون ہو جاتا ہے، اُس وقت عشا کی نماز ادا کیجاتی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین نماز کے اوقات کے ذکر مین آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے،

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، (اسرائیل-۹)	نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت رات کی تاریکی تک (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز (تفصیل آگے آتی ہے)،

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام مین کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہین رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازین آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات مین ہین، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام مین آفتاب نکلتے وقت، اُس کے عروج و کمال کے وقت، اور اُس کے ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستون کی عبادت کے خاص اوقات ہین[1]

اسلام مین طریق و اوقاتِ نماز

نماز کس طرح اور کن کن اوقات مین اور کسکے رکعتین کرکے پڑھنی چاہئے، اور اس کے کیا کیا آداب و شرائط ہین، ان سب کے لئے قرآنِ پاک مین ایک جامع آیت ہے، جو لڑائی کی حالت مین نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ مین مذکور ہے،

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا، ۱۲

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى	نمازون پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو، اور اللہ
وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ. فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا	کے لئے (نماز مین) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر (دشمن
اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا	کا) خوف ہو تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھ)
عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ.	پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد
	کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے
(بقرہ ۸-۳۱)	واقف نہ تھے،

اس آیت پاک سے یہ بات تصریح ظاہر ہوتی ہے، کہ ان باتون کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات مین اور کتنی رکعتون کے ساتھ پڑھنی چاہئے خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآن پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث مین تحریراً، اور مسلمانون کے نسلاً بعد نسلٍ متفقہ تواتر عمل مین عملاً موجود ہے، اور قرآن پاک مین اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہین،

نمازون کی پابندی ونگرانی،

اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازون کو پابندی سے ادا کرین، ان کی نگہداشت رکھین اور ان پر مداومت کرین، قرآن پاک مین نماز کی پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لئے ایک خاص لفظ "محافظت" کا استعمال کیا گیا ہے، جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہین، اور جس کی وسعت مین پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا، اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہین، فرمایا،

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ ، (بقرہ ۸-۳۱)	نمازون کی نگرانی رکھو،
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (معارج-۱)	اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہین،
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (مومنین-۱)	اور جو لوگ اپنی نمازون کی نگرانی رکھتے ہین،
وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ. (انعام-۱۱)	اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہین،

ایک آیت مین یہ بھی فرمایا،

الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ، (معارج-۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین،

ان آیتون سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال مین معاف نہین ہوسکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر، اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے،

نماز کے اوقات مقرر ہین | اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہین، ارشاد ہے،

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا، (نساء-۱۵) بےشبہہ نماز مسلمانون پر مقررہ اوقات مین فرض ہے،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازون کے لئے اوقات مخصوص ہین،

وہ اوقات کیا ہین | ادائے نماز کے لئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہین، صلوٰۃ یا اقامتِ صلوٰۃ، تسبیح، اور ذکر اللہ، پہلا لفظ اقامتِ صلوٰۃ نماز کے لئے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح و تحمید اور یادِ الٰہی اور نماز کے لئے بولا جاتا ہے جس کا جزرِ اعظم تسبیح و تحمید ہے، احادیث مین بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہین،[1] اور اشعارِ عرب[2] و لغتِ عرب[3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن مین جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہین ہوسکتی، کیونکہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام مین نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہین ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہان تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہوسکتی ہے،

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتون پر نظر کرنی چاہئے،

---

[1] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الضحیٰ، ما رایت رسول اللہ صلعم یصلی سبحۃ الضحیٰ قط، وانی لاستحبہا نیز صحیح مسلم، باب جواز النافلۃ علی الدابۃ و باب و کنت اسبح فقام قبل ان اقضی سبحتی،

[2] اعشیٰ وائل کا شعر ہے، وسبح علی حین العشیات والضحیٰ ولا تعبد الشیطان واللہ فاحمدا (شعراء الجاہلیۃ جلد ۳ صفحہ ۳۶۵)

[3] لسان العرب جلد ۳ صفحہ ۲۱۴ مصر

۱- قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا، (مزمل-۱)

۱- رات کو کھڑا رہا کر، مگر کچھ کم، یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا لے اور قرآن (آہستہ) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ،

۲- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (المؤمن-۶)

۲- اور اپنے پروردگار کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر،

۳- وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (احزاب-۶)

۳- اور تم اوسکی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو،

۴- وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (فتح-۱)

۴- اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو،

۵- وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (اعراف-۲۴)

۵- اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور ڈر کر، اور پست آواز میں صبح کو اور سہ پہر کو یاد کر، اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو،

۶- وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ، (انعام-۶)

۶- اور (اے رسول) ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں،

۷- فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ۔ الاٰیۃ (نور-۵-)

۷- ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے، اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جنکو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا صبح اور سہ پہر خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں،

۸- وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ، (کہف-۴)

۸- اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کیساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح

۹- وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَ	۹- اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر
مِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ	جب تو اٹھتا ہے، اور رات کے کچھ حصہ مین اسکی
(طور-۲)	تسبیح کر اور ستارون کے پیٹھ پھیرتے وقت،
۱۰- وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا	۱۰- اور نماز کو قائم کر دن کے دونون کنارون مین اور
مِّنَ الَّيْلِ، (هود-۱۰)	رات کے کچھ ٹکڑون مین،
۱۱- اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى	۱۱- نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات
غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اِنَّ قُرْاٰنَ	کی ابتدائی تاریکی تک، اور فجر کا پڑھنا،
الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا، وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ	بیشک فجر کا پڑھنا پُرحضور ہے، اور رات کو
بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ، (اسرائیل-۹)	کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ، (تہجد)
۱۲- وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا	۱۲- اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر، صبح کو،
وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا	سہ پہر کو، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر، اور
طَوِيْلًا، (دھر-۲)	بڑی رات تک اسکی تسبیح کر،
۱۳- فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ	۱۳- کافرون کے کہے پر صبر کر، اور اپنے پروردگار
رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ	کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور
غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ	اس کے ڈوبنے سے پہلے، اور رات کے کچھ حصون
وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى	مین اس کی تسبیح پڑھ، اور دن کے کنارون
(طٰه-۸)	مین، تاکہ تو خوش رہے،
۱۴- فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ	۱۴- تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو، اور جب
تُصْبِحُوْنَ، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ	صبح کرو، اور اسکی حمد آسمانون، اور زمین

وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (روم-۲)	مین، اور سہ پہر کو اور جب تم دوپہر کرو،
۱۵- فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	۱۵- تو ان کافرون کے کہے پر صبر کر، اور
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب
وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ،	نکلنے سے پہلے، اور ڈوبنے سے پہلے، اور کچھ
(ق-۳)	رات مین تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد،
۱۶- مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ	۱۶- فجر کی نماز سے پہلے، اور جب دوپہر کی گرمی
ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ	کے سبب کپڑے اتارتے ہو، اور عشار کی
صَلٰوةِ الْعِشَاءِ، (نور-۸)	نماز کے بعد،

ان اوپر کی آیتون مین نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان مین سے بعض مکرر ہین، اور بعض نہین، مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہین، جنہین رسول اللہ صلعم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے، اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ، اور اُس وقت سے لیکر آج تک تمام روے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہین، اور جن کے مشہور نام فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا ہین، غدو، غداۃ، بکرہ، فجر، قبل طلوع الشمس، اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل، عشی، اور قبل غروب شمس، سے مراد عصر، دلوک الشمس (زوال) اور حین تظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النہار (دن کا کنارہ) اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب، اور من آناء الیل (کچھ رات گذرے) غسق الیل (رات کی ابتدائی تاریکی)، اور صلوۃ العشار سے مقصود عشا کی نماز ہے، اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہین جنہین خدا کی یاد اور تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے،

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے، کہ کس غربت، مظلومی اور بے سروسامانی کیساتھ ہوا تھا، اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورۂ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے، یہ آیتیں آئی ہیں،

یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۙ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلًا ؕ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ؕ (مزمل - ۱)	اے کملی اوڑھ کر سونے والے! تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ، اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں، (یعنی شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے، اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے، بے شبہہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے،

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی، کیونکہ جہاں وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء - ۱۱) (اپنے قریب کے اہلِ خاندان کو ہشیار کرو) کے ذریعہ سے

دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہین یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ، (شعراء - ۱۱)	اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ، جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے، اور نمازیون مین تیرا پھرنا دیکھتا ہے، بیشک وہی سنتا اور جانتا ہے،

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت صلعم ان دشمنون کے بیچ مین راتون کو اٹھکر خود نماز پڑھتے تھے، اور مسلمانون کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز مین مصروف ہے، اور کون سویا ہوا ہے، جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے، ایسی پرخطر حالت مین آپکا راتون کو تنِ تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے، اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے، اس کے بعد جب نسبتہً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشا) اور تارون کے جھلملاتے وقت بھی ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ، (طور - ۲)	اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بیشک تو ہماری آنکھون کے سامنے ہے، اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے، اور کچھ رات کے حصہ مین اس کی تسبیح کر اور ستارون کے پیٹھ پھیرتے وقت،

یہ آیت سورۂ طور کے آخر مین ہے، اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ مین نازل ہوئی تھی،[1]

---

[1] صحیح بخاری تفسیر طور، واقعہ جبیر بن مطعم،

اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلعم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا، کیونکہ اس سورہ مین اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب، اور ان پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپکی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازون کی تفریق ہے، سورۂ دہر مین جو جمہور کے نزدیک مکی ہے، اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری ہے، انھین معنون کی ایک اور آیت ہے، جس مین ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہئے اور بڑھتی ہے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا	تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر، اور ان
أَوْ كَفُورًا، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً	مخالفون مین سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گذار
وَّأَصِيلًا، وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَ	کا کہنا نہ مان، اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے
سَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا،	پروردگار کا نام لیا کر، اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ
(دہر-۲)	کر، اور رات کو دیر تک اسکی تسبیح کیا کر،

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتون کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن، اور ابتدائی شب، مگر ہنوز "اصیل[1]" مین ظہر و عصر اور مِنَ اللَّيْلِ (رات) مین مغرب اور عشا کی تفریق نہین ہوئی تھی، کیونکہ کل تین نمازین تھین، ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو، اور ایک رات کو، اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازون کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے،

اب یہ ان تین وقتون کی "تسبیح و تحمید" باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہین، حکم ہوتا ہے،

أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ[2] وَزُلَفًا	دن کے دونون کنارون مین (یعنی فجر اور عصر)

[1] "اصیل" دن کے آخری حصہ کو کہتے ہین، عام کتب لغت مین لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہین، لسان العرب مین اصیل کے معنی عشی لکھے ہین، جو عصر کے لئے سورۂ روم مین استعمال ہوا ہے،

[2] طرفی النہار کو مختلف طریقون سے قرآن مجید مین ادا کیا گیا ہے، قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا، بالعشی والابکار، بالغدو والآصال، انمین پہلا طرف فجر، بکرۃ، اور غدو ہے، دوسرا طرف عصر، عشی اور اصیل ہے،

وَّمِنَ الَّیۡلِ، (ھود- ١٠) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر،

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کرکے کہ انھوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے، اور غالبًا نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے، جس میں "تسبیح" کے بجائے باقاعدہ "صلوٰۃ" کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے،

فَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَمَنۡ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطۡغَوۡا، (ھود- ١٠) پس تو سیدھا چلا چل، جیسا کہ تجھکو حکم دیا گیا ہے، اور وہ جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو،

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں، ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب، تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب، اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں، پہلی سے صبح کی نماز دوسری سے عصر کی جسکو پہلے اصیل کہا گیا تھا، اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے، ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا، دوسری میں ظہر و عصر، اور تیسری میں مغرب و عشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں، اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں، سورۂ قٓ میں جو مکی سورہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے،

فَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ، پس ان (مخالفون) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر، اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار

کی حمد و تسبیح کر، اور کچھ رات گئے پر (عشا) اس کی
تسبیح کر، اور (آفتاب کے) سجدہ کرنے کے بعد
(غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح)

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تحقیر کے درپے تھے، اس آیتِ پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے **مغرب** اور **عشا** کی تعیین کر دی گئی، ایک کی نسبت کہا گیا وَمِنَ اللَّیْلِ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا وَاِدْبَارَ السُّجُوْدِ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقاتِ نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبتہً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا، زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل، اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں "قبل غروب" کی نماز کہا گیا ہے، ہنوز تفصیل طلب ہے، جس کے اندر ظہر و عصر دونوں نمازیں داخل ہیں، چنانچہ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے، اس کی تفصیل کی گئی ہے، اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکستِ کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لیکر آٹھویں نویں سال تک ہے،

فَسُبْحَانَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ — اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو، اور

سلہ آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے، اس لئے ادبار السجود سے، ادبار سجود الشمس مراد ہے، جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے، آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے، کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے، چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا، اس لئے کلام کی فصاحت کا اقتضا یہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے، چنانچہ اس معنی کے لیے سجود کا لفظ استعارةً لایا گیا، سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں، اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے، اس طرزِ ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجود شمس کا ذکر کیا، کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے آگے سجدہ میں ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ، تفسیروں میں حضرت علیؓ سے روایتیں ہیں، کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں،

تُصْبِحُوْنَ، وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — جب صبح کرو، اور اُس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے

وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ، (روم-۲) — اور آخیر دن کو اُسکی تسبیح کرو، اور جب ظہر کرو،

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازون کی توضیح کی گئی ہے، ایک کو عَشِیّ (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے، تمام آیتون کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر، طٰہٰ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں، ظہر کا بالاجمال دہر، ق، طٰہٰ اور اسرار میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، ق اور روم میں، مغرب کا بالاجمال ہود، طٰہٰ، اور روم میں اور بالتصریح ق میں، عشا کا بصورت صلاۃ اللیل، مزمل، طور اور دہر میں، اور بصورت عشا، بالاجمال طٰہٰ، ہود، اور روم میں اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے، تمام نمازون کا بالاجمال تذکرہ بقرہ، اسرار اور طٰہٰ میں ہے، طور سے فجر اور عشا، دو وقتون کی نماز، اسراء، ہود، اور طٰہٰ سے کم ازکم بظاہر تین وقتون کی روم سے چار وقتون کی (اگر مسا، سے صرف مغرب مرادلین) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتون کی نماز ثابت ہے،

ایک نکتہ

جمع بین الصلوتین

اوپر کی آیتون پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے، پہلی آیتون میں ظہر اور عصر کی نمازین مجمل ہیں، یعنی دونون کو ایک لفظ "قبل الغروب" یا "اصیل" یا "طرفی النہار" کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے، آخری آیت میں جو سورۂ روم کی ہے، ظہر و عصر کی نمازون کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نمازین اجمال ہے، یعنی مغرب وعشا دونون کو حِيْنَ تُمْسُوْنَ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کردیا گیا ہے، اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے، کہ یہ دونون مل کر ایک بھی ہین اور علحدہ بھی ہین، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کرسکتے ہین، اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں

ہمیشہ علیحدہ ذکر کیگئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہین ہے، احادیث مین جمع بین الصلوتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالین اس نکتہ قرآنی کی تشریح مین موجود ہین،

اوقاتِ پنجگانہ اور آیت اسرار

محدثین اور مورخین کا اتفاقِ عام ہے کہ نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین معراج مین ہوئی ہے، جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہوین سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر سورہ ق اور روم مین موجود ہے، جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھین لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسرار (معراج) مین نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلوٰۃ اسی معراج مین ہوئی جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن مین مدنی سورتون کے اندر نازل ہوا ہے، سورۂ اسرار (معراج) کی وہ آیت جسمین نماز پنجگانہ کا ذکر ہے حسب ذیل ہے،

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک
الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ	نماز کھڑی کر، اور فجر کی قرأت قائم کر، بے شک
مَشْهُوْدًا، (اسراء ۔ ۹)	فجر کی قرأت مین حضور ہوتا ہے،

یہ آیتِ کریمہ اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے، اس مین

(حاشیہ صفحہ ۹) لہ موطا امام مالک مسلم ترمذی باب القصر فی الصلوۃ فی السفر والحضر بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوتین کی حدیثین دیکھکر یہ شبہہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی مین شاید تین وقت کی نمازین ادا ہوتی تھین (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین فاضل ونیسنک کو بھی یہی شبہہ ہوا ہے، دیکھو اسکا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ نہین ہے بلکہ نمازین ہمیشہ پانچ وقتون کی ہوتی تھین، البتہ بضرورت ظہر وعصر کو ایک ساتھ، اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے، رکعتین اتنی ہی رہتی تھین، صرف وقت مین کمی ہو جاتی تھی، فقہا مین باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتون مین پڑھا جا سکتا ہے، احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر حج مین عرفات مین ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونون ظہر کے وقت ادا کیجاتی ہین کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤن کیلئے ہے، بقیہ نمازون مین حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجائی نہین، بلکہ محض صورۃً دو دو نمازین ایک ساتھ ادا کیجا سکتی ہین، اسکی صورت یہ ہے کہ ایک نماز آخیر وقت مین اور دوسری اوّل وقت مین پڑھی جائے، حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہا کے نزدیک سفر مین حقیقۃً دو نمازین یکجا ایک وقت مین پڑھی جا سکتی ہین اور آنحضرت صلعم نے ایسا کیا ہے، شیعون مین دو دو نمازون کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے،

سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ "دلوک" ہے، دلوک کے اصلی معنی "جھکنے" اور "مائل" ہونے" کے ہیں،
لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ "دلوک الشمس" یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہل عرب اس کو کن معنون
مین بولتے ہین، حقیقت یہ ہے کہ عربی مین اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتون پر ہوتا
ہے. زوال پر، مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر، اور غروب پر، اور جب آیت مذکور مین یہ
کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو، تو ان تینون دلوکات یعنی آفتاب کے تینون جھکاؤ پر
ایک ایک نماز لازم آئی، غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے،
تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہین، ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے، اور تیسرا دائرہ
افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا، اور تیسرا مغرب کا، اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی
خدائی کی نفی و تردید، اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لئے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے،
اس طرح "دلوک" کے لفظ کے اندر تین نمازون کے وقت بتائے گئے ہین، چوتھی نماز کا وقت "غسق اللیل"
(رات کی تاریکی) ہے، یہ عشا کی نماز ہے، اور اس کو حقیقت مین نصف شب کو ادا ہونا چاہئے، جب آفتاب
کا چہرۂ نورانی تو بر تو حجابات ظلمت مین چھپ جاتا ہے، لیکن لوگون کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے
پہلے رکھی گئی، تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے، اور پانچوین نماز کا وقت "قرآن الفجر"
(صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کیجاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر
اپنے پرستارون کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق
اکبر کا نام لے، اور اس باطل پرستی سے جس مین آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہین، بیزاری
ظاہر کرے، غرض اس آیت پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب ہم کو یہ دیکھنا
ہے کہ کلام عرب مین آفتاب کے ان تینون جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے، اگر کلام عرب
سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے مین کسی کو عذر نہ ہوگا،

دلوک کی تحقیق مفسرین میں سے بعض نے "دلوک" سے زوال کا وقت، اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہلِ لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا، اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے،

ودلکت الشمس تدلك دلوکاً غربت	آفتاب کا دلوک ہوا، یعنی وہ غروب[1] ہوا، اور کہا گیا
وقیل اصفرت ومالت للغروب، و	ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب[2] زرد ہو گیا
فی التنزیل العزیز "اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ	اور غروب کے لئے جھک گیا، اور قرآن میں ہے کہ
الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ" وقد دلکت	"دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز
زالت عن کبد السماء ...... و	کھڑی کر"، اور آفتاب کو دلوک ہوا، یعنی وہ آسمان[3]
قال الفراء عن ابن عباس فی دلوک	کے بیچ سے ہٹ گیا...... اور فراء نے کہا
الشمس انه زوالها الظهر قال ورأیت	کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ دلوکِ شمس
العرب یذهبون بالدلوک الی	کے معنی ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں
غیاب الشمس، قال الشاعر،	اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کو دلوک
	سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے
هذا مقامُ قدمَی رباحِ ذبّبَ حتیّ دلکت براحِ	"یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں
یعنی الشمس، قال ابو منصور وقد روینا	قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی
عن ابن مسعود انه قال دلوک الشمس	حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا"
غروبها وروی ابن هانئ عن الاخفش	ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود سے روایت
انه قال، دلوک الشمس من زوالها الی	کی ہے، کہ "دلوکِ شمس آفتاب کا غروب ہے" اور

غروبها، وقال الزجاج دلوك الشمس
زوالها فی وقت الظهر، وذالک میلها
للغروب وهو دلوکها ایضًا، یقال دلکت
براح وبراحِ ای قد مالت للزوال
حتی کاد الناظر یحتاج اذا تبصرها ان
یکسر الشعاع عن بصرہ براحته . . .
فان قیل ما معنی الدلوک فی کلام
العرب قیل الدلوک الزوالُ ولذالک
قیل للشمس اذا زالت نصف النهار
دالکة وقیل لها اذا افلتْ دالکة
لانّها فی الحالتین زائلة . . . .
. . . قال الفراء فی قوله براح جمع
راحة وهی الکفُّ یقول یضع کفه علی
عینیه ینظر هل غربت الشمس بعدُ

ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ "دلوک شمس زوال
سے غروب تک ہے" اور زجاج نے کہا کہ دلوک
شمس ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے، اور
اس کے معنی غروب کے لئے جھکنا بھی ہیں، اور
یہ بھی اس کا دلوک ہے؛ محاورہ میں کہا جاتا ہے
کہ دلکت بَراح و بَراحِ یعنی آفتاب زوال کیلئے
جھک گیا، یہانتک کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا
چاہے تو اس کی کرن کی شدت کو توڑنے کیلئے
اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہو . . .
. . . تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ مین
دلوک کے کیا معنی ہین؟ تو جواب دیا جائیگا کہ دلوک
کے معنی زوال کے ہین، اور اسی لئے آفتاب
کو "دالکہ" کہتے ہین، جب وہ دوپہر کو جھک جائے،
اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے، تب بھی اسکو
"دالکہ" کہتے ہین، کیونکہ ان دونون حالتون مین
وہ جھک جاتا ہے، فرّاء نے کہا کہ اس قول (شعر
یا محاورہ) مین جو براح کا لفظ ہے یہ راحہ کی جمع ہے
جس کے معنی ہتھیلی کے ہین، کہنے والے کا مطلب
یہ ہے کہ وہ دونون آنکھون پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے

[illegible]

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے، عجاج کہتا ہے،

والشمس قد کادت تکون دنفا   ادفعہا بالراح کی تزحلفا

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر ڈوبا ہو جائے، میں اسکو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے[1]

اس دوسرے شعر سے، پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اسکا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے، دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے، جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے، اور مغرب طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لئے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے، ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گذرا تسامحاً یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے، اوّل اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے، اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے، اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ،   آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر،

---

[1] یہ شعر تفسیر طبری میں آیت مذکورہ کے تحت میں، اور لسان العرب میں دلف اور زحلف کے تحت میں مذکور ہے،

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں، ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، عصر جب اس کا دلوک سمت نظر سے ہوتا ہے، اور مغرب جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے[1]، اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشا اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیت پاک سے جو سورۂ اسراء میں واقع ہے، اوقات پنجگانہ میں اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے،

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز اس آیتِ کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلانِ اولِ آفتاب) سے ہوتا ہے، اور یہی اُس حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں بذریعۂ جبریل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر ہے[2]، اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے، پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا، ظہر کے بعد، عصر، پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشا، یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشا سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے، اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اسی قدر فصل ہے، چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشا تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے، اور اُسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے، غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب، اور مغرب سے عشا تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے، اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے، جو صبح سے ظہر تک ہے، اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے،

---

[1] تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انہیں نمازوں کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے، حضرت ابن مسعود دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس زوال آفتاب مراد لیتے ہیں، اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشا سمجھتے ہیں، اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشا اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے، اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقات پنجگانہ کو بتاتی ہے،

[2] سیرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ،

اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت

سورۂ اسرا، کی آیت کی طرح سورۂ طٰہٰ مین بھی ایک آیت ہے جس مین اوقاتِ پنجگانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے،

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب[1] نکلنے سے
قَبْلَ غُرُوْبِهَا ج وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ	پہلے، اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے[2] اور
وَاَطْرَافَ النَّهَارِ، (طٰہٰ - ۸)	رات کے کچھ وقت مین[3] تسبیح پڑھ، اور دن کے کنارون[4] مین

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر[1] ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر[2] ہے، رات کے کچھ وقت سے عشا[3] مراد ہے، اور دن کے کنارون مین ظہر[4] اور مغرب[5] ہے،

اطراف النہار کی تحقیق

یہ شبہہ کیا جاسکتا ہے کہ "اَطْرَاف" کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئین، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہین صبح اور شام، یا تین ہین اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے، یعنی صبح، دوپہر اور شام، پہلی شق لیجائے تو صبح کا ذکر مکرر ہوجاتا ہے، اور ظہر غائب ہوجاتی ہے، دوسری شق اختیار کیجائے تو گو ظہر آجاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر رہتی ہے،

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے مگر کلامِ عرب مین تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے، اور خود قرآن مجید مین اس کے استعمالات موجود ہین، مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین "دو مشرق اور دو مغرب" ہے، دوسری جگہ انھین کو "مشارق" اور "مغارب" کہا گیا ہے، سورۂ تحریم مین ہے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تم دونون کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیون کے دو قلب ہونگے، قلوب (بصیغہ جمع) نہین ہوسکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے، اس مین قیاس اور عقلیت کو دخل نہین، اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہین، یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہین، ایک صبح سے دوپہر تک، اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے انہین دونون حصون کے آخری کنارے یہان مراد ہین، صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے، اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری

کنارہ عصر یا مغرب ہی لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبہا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لئے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے،

ایک اور طریقہ ثبوت | اگر ہم قرآن پاک کی علٰحدہ علٰحدہ آیتوں سے اوقات پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، مثلاً

۱- اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (اسرٰء-۹) زوالِ آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر، یہ ظہر کی نماز ہے،

۲- وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ، (ق-۳) اور غروبِ آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو،

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (دہر-۲) اور اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر کو، یہ عصر کی نماز ہوئی، اور اسی کو وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰى (بقرہ-۳۱) (بیچ کی نماز) سورہ بقرہ میں اسلئے کہا گیا ہے، کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے،

۳- وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (ہود-۱۰) اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر،

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے،

۴- سورہ نور میں ہے، کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ گھر یا مکان میں نہ جایا کرو،

مِنْ قَبْلِ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ (نور-۸) صبح کی نماز سے پہلے،

اس سے نماز صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے،

۵- وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوۃِ الْعِشَاءِ، اور عشا کی نماز کے بعد،

اس کے روسے مسلمانوں کو عشا کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اتار دینے کا وقت ہے، کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نماز عشا کا عملی ثبوت ہے، اور یہی پانچوں اوقات نماز

لہ الاصیل الوقت بعد العصر الی المغرب (صحاح جوہری و لسان العرب)

نماز پنجگانہ احادیث وسنت مین

تمام انبیاء علیہم السّلام مین آنحضرت صلعم کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لیکر آئے اسکی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی، اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی، اور خود عمل فرما کر، اور اپنے تمام پیرو ون سے اس کی تعمیل کرا کر اُس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا، آنحضرت صلعم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان و آداب وشرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرما دی، اوران مین سے ہر چیز ناقابل شک قولی وعملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہیئے، اس مین کیا کیا پڑھنا چاہیئے، کن کن وقتون مین پڑھنی چاہیئے، کس وقت کی نماز کی کئے رکعتین ہین، ان مین سے ہر چیز کی آپنے زبانی تشریح فرمائی، صحابہؓ کو تلقین کی، اور عملاً نبوت کی پوری زندگی مین جو حکم نماز کے بعد گذری، ایک دن دو دن نہین کم از کم مدینہ مین متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ، تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ، ادا فرماتے رہے، یہانتک کہ مرض الموت مین بھی اس مین تخلف نہ ہوا اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا، مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدون مین پنجوقتہ اعلان نماز کی آوازین بلند ہوئین اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہان اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا، آپ کے بعد تمام خلفاے راشدین اور تمام پیروان محمدی جہان بھی رہے، اور جہان بھی پہنچے، اسی طرح دن مین پانچ بار علی الاشہاد سفر و حضر مین تمام عمر ادا کرتے رہے، کیا ایسی مستمر، علی الاعلان، متواتر، اور دائمی چیز مین کسی کو شک واقع ہوسکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار، اور یہ تاکید بلیغ، اس لئے فرمائی تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبرون کا طریق عبادت بعد کے پیرو ون کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہوگیا، خاتم الانبیاء کی شریعت آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیونکہ اگر اب اس شریعت مین شک پڑجاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آکر اسکی تجدید واصلاح کرنے والی نہ تھی، چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروان محمدی مین آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری

اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایۃً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں، نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیتِ خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعتِ سعید میں دیا جب آنحضرت صلعم معراج کے تقربِ خاص سے ممتاز ہوئے حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں، جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں[1]، قرآنِ پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، ارشاد ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (انعام - ۲۰) یعنی جو ایک نیکی کریگا، اس کو دس گونہ ثواب ملیگا، اس لئے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں؛

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریقِ ادا اور اس کے اوقاتِ خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتدا اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر جزئی کی تلقین کی[2]، اور وہی آپ نے اپنے پیروؤں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا،

چنانچہ آپ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے، تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کرکے آیا تھا، خدمتِ اقدس میں آکر عرض کی یا رسول اللہ آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، کیا یہ سچ ہے، فرمایا ہاں سچ ہے، عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں[3]؛

خود آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ جبرئیل اترے اور انہوں نے میری امامت کی، تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو تین چار پانچ گنتے جاتے تھے[4]، ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کرکے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو، اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو، تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہیں، نہیں رہیگا، فرمایا تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے

---

[1] بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ، کتاب الصلوٰۃ و کتاب الاسراء [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس،
[3] صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام ۱۲ و صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص۲۴ و ۲۵، مصر،
[4] صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا باب اوقات الصلوٰۃ الخمس،

اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے[1]، اوقات کی تعیین میں فرمایا، کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اسوقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اسوقت تک اسکا وقت ہے جبتک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اسکا موقع اسوقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو، تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشا پڑھو تو آدھی رات تک اسکا وقت ہے[2]،

ابو برزہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قرأت کرتے تھے، اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے، اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جاکر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا، اور عشا کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے[3]، حضرت جابرؓ دوسرے صحابی نقل کرتے ہیں، کہ آنحضرت صلعم ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے، اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا، اور عشا میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت، اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے[4]، صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کیساتھ سورہ پڑھتے تھے، کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی، مغرب میں سورۂ المرسلت پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی، عشا میں اذا السماء انشقت اور والتین والزیتون قرأت کی ہے، اور صبح میں سورۂ طور پڑھی ہے[5]،

اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں، اور روایتوں پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام امتیان محمد رسول اللہ صلعم کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے[6]،

تہجد اب نفل ہو گئی لیکن کیوں؟ ان نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کیلئے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب الصلوات الخمس کفارۃ، [2] صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس، [3] صحیح بخاری باب وقت الظہر عند الزوال [4] صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا، [5] ایضا باب القراءۃ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء والفجر، بروایات متعددہ، [6] چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقات نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے، اسلئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی، تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے،

نفل ہوگئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہے

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ، وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ، (اسراء - ۹)

نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر، عصر مغرب) رات کی تاریکی تک، اور صبح کی قراءت قائم کر بے شک صبح کی قرأت میں حضور ہوتا ہے، اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھکو تیرا رب قابل تعریف مقام (پر کھڑا کرے)

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو اُن کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی، اور حکم آیا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ، یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو، اس کے بعد اس آیت پاک میں جب اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز کی تہجد کی فرضیت ساقط ہوگئی، یہاں ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی،

قبلہ انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہوسکتا، جس کی بنا پر اوقات نماز کی تعیین کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہوسکتا، جب انسان کوئی کام کریگا تو ظاہر ہے کہ اس کا منھ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعیین نہ ہوتا، اور یہ عام اجازت دیدیجاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منھ کرکے نماز ادا کرے، تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہوجاتا، اور نمازیوں کی وحدت صوری قائم نہ رہتی،

لہ صحیح مسلم جلد اول باب وجوب قراءۃ الفاتحہ، حدیث ارجع فصلّ فانک لم تصل، نیز دیکھو فتح الباری جلد اول صفحہ ۳۹۳،

بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم، کوئی اوتر اور کوئی دکھن رخ کرکے کھڑا ہوتا تو یہ وحدتِ نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا، اس لئے ہر مذہب میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کرلیگئی ہے، صابئی (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے، کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے[۱]، آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں، اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں، یہانتک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ السینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنا لیا تھا، شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے[۲]، بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے، اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل" بنا لیتے تھے[۳]، قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے، تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں،

وَّاجۡعَلُوۡا بُيُوۡتَكُمۡ قِبۡلَةً وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ (یونس-۹) اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرلو اور نماز کھڑی کرو،

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعۂ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے، حضرت داؤدؑ کے زبور میں ہے:-

"لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤنگا، اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کرونگا" (۵-۷)

سلاطینِ اوّل میں ہے:-

---

[۱] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ، [۲] یہ تفصیلات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "قبلہ" میں ہیں،
[۳] سفر تکوین باب ۱۲-۸، ۱۳-۱۸، ۲۶-۲۵، ۲۸-۱۸، ۱۹ و ۳۱-۱۳،

"جب تیرا گروہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہاں کہیں تو انہیں بھیجدے، اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تونے پسند کیا، اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لئے بنایا۔" (۷-۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے :-

"اور اس زمین کی طرف جو تونے ان کے باپ دادوں کو دی، اور اس شہر کیطرف جسے تونے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لئے بنایا تجھ سے دعا مانگیں" (۴۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی، جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی، اس لئے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے،

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۔ (بقرہ-۱۸)	اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھر وہ منہ پھیرتی ہے، تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو،

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست، یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لئے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رُخ یعنی مشرق کو، اور صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے ابراہیمی قوموں میں اس قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانۂ کعبہ)، پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحٰق اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لئے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیل اور اُن کے بیٹے تھے، جنہوں نے اس کو قبلہ بنا لیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے، کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑجاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس

مدینہ سے شمال اور خانۂ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک اجازت نازل نہین ہوئی تھی، آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے، کہ وہی انبیاے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملّتِ ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانۂ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسمٰعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط مین اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن مین سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہین، کیونکہ وہ بے سمت ہے، اور سب سمتین اسی کی ہین،

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا	اور خدا ہی کے لئے ہے، پورب اور پچھم، تو جدھر
فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	رخ کرو اُدھر ہی خدا کا منھ ہے، بیشک اللہ بڑی
(بقرہ ۱۴-۱۴۰)	گنجایش اور وسعت والا، اور بڑے علم والا ہے،

اس کی گنجایش اور وسعت مین ہر سمت داخل ہے، اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعًا غلط قرار دیتی ہے، دوسری آیت مین بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے،

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ	بے وقوف لوگ کہین گے کہ ان (مسلمانون) کو
عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا	ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا جس پر وہ
قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ	تھے، کہدے کہ پورب اور پچھم دونون خدا کے ہین
مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (بقرہ-۱۷)	وہ جسکو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے،

یہود جن کو سب سے زیادہ یہ اعتراض تھا، کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیون قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کرکے فرمایا،

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ	نیکی یہی نہین کہ تم اپنے منھ مشرق اور مغرب کی

وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ | طرف پھیرو، البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتون
الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ | کتاب اور پیغمبرون پر ایمان لائے اور اپنی دولت
اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى | کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر)
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ | رشتہ دارون، یتیمون، غریبون، مسافرون،
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ | سائلون اور غلامون کو آزاد کرانے مین) دے
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ | اور نماز پڑھے، اور زکوۃ دے اور (نیکی یہ ہی)
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ | جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہین اور سختی اور تکلیف
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ | اور جنگ مین صبر کرتے ہین، یہی وہ ہین جو سچے

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ ۲۲) ہوئے اور یہی پرہیزگار ہین،

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام مین قبلہ کی کیا حیثیت ہے قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رُخ کیا جائے عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہین ہے، لیکن چونکہ نمازون مین امت کے نظامِ وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لئے ۲ھ مین خانۂ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا،

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَ | پس تو اپنا منھ مسجد حرام (خانۂ کعبہ) کی طرف پھیر
حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ ۱۷) | اور تم لوگ جہان بھی ہو اسی کی طرف اپنے منھ پھیرو،

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہین، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا جس کے چارون طرف چارون سمتون سے نماز پڑھی جا سکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بیک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہین، جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانون کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے، اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب

یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی، اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا، اس کا کلیۃً خاتمہ ہو گیا،

لیکن یہ مرکزی مسجد، بیت المقدس کے بجائے مسجدِ حرام (کعبہ) قرار دیگئی جس مین بہت سی مصلحتین تھین،

۱- یہ ضرور تھا کہ قبلہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے، ہر ملک مین منھ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی، مثلاً کوئی چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذرا بعض اہلِ مذاہب اُن چیزون کو سامنے رکھتے تھے، جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر کو، اب ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی مین گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہین بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت مین "جگہ سے نہ ٹلنے والا" قطب تھا اور دوسری چہرۂ خورشید کا مطلع اور بیاضِ سحر کا دیباچہ تھی، دینِ توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا، کہ ستارہ پرستی کے ابطال کیساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے،

۲- یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منھ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جا سکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتون مین سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجّح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا تھا، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی، اب جو بھی سمت اختیار کیجاتی اسکے لئے ضرور تھا، کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستارو کے طلوع و غروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہین، کیونکہ ہر سمت مین کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کیگئی ہے، اس لئے جو سمت بھی اختیار کیجاتی، اس سے اس سمت کے خاص ستارہ کے متعلق وجہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا، اور اس ترجیح سے دینِ توحید کا دینِ شرک بنجانا لازمی تھا،

۳- اسی لئے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتون کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے، حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدون مین سے اُن کی نسل نے دو مرکزی مسجدون کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے اپنے اپنے زمانون مین بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی،

(۴) اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانۂ کعبہ بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا مین پہلا گھر تھا، جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا، اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے،

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا ، (اٰل عمران - ۱۰)	بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانون کے لئے (خدا کا) بنا، وہ ہے جو مکہ مین ہے،
وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ، (بقرہ - ۱۵)	اور جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ بیت اللہ کے کھبے اٹھا رہے تھے،

خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہدِ اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآن پاک مین ہے،

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ ، (بقرہ - ۱۷)	اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہین کہ خانۂ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے، (اور وہ) اُن کے پروردگار کی طرف سے (ہے)

پولوس (پال) ایک خط مین جو گلیتون کے نام ہے لکھتا ہے،

"کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسماعیل) جسم کے طور پر پیدا ہوا،

اور جو آزاد سے تھا (اسحٰق) سو وعدہ کے طور پر، یہ باتین تمثیلی بھی مانی جاتی ہین، اس لئے کہ یہ عورتین دو عہد ہین، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھین، اور سینا مصر کے راستہ مین ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہین، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے، اور یہی اپنے لڑکون کے ساتھ غلامی مین ہے، پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے،   (گلیتون کے نام ۲۲-۲۶، باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ علیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہین، "اب کے یروشلم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونون عورتین دو عہد تھین یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھین، اور راستہ مین سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی "غلام اولاد" نے عرب مین عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہوگئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادتگاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا یہان ذکر نہین ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرّد، سرکشی اور فسادت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا، جس کا ذکر سورۂ اسرا کی آیتون مین ہے، اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسمٰعیل کا وہ عہد شروع کیا جو "سینا" پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا،

معراج مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس کے چند سال

بعد خانۂ کعبہ کا قبلہ بنجانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست، اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدار کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد مین بسلسلۂ معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا	پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی	مسجد حرام (خانۂ کعبہ) سے اس مسجد اقصٰی (بیت المقدس)
الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ، (بنی اسرائیل-۱)	تک لے گیا جس کی چارون طرف ہمنے برکت دی ہے

کی تفسیر مین لکھا گیا ہے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس مین قبلہ ہونے کی شان باقی نہین رہی، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی، جسکا تعلق عہدِ اسماعیلی سے تھا (یعنی خانۂ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے،

وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ	اور جب خدا نے چند باتون مین ابراہیم کو آزمایا
فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ	تو اس نے ان باتون کو پورا کیا، خدا نے کہا مین
اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا	تجھ کو لوگون کا پیشوا بنانے والا ہون، (ابراہیم
یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ، وَاِذْ جَعَلْنَا	نے) کہا اور میری نسل مین سے (خدا نے) فرمایا
الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا	میرا عہد ظالمون کو شامل نہ ہوگا، اور جب ہمنے
مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدْنَاۤ	گھر (کعبہ) کو لوگون کے اجتماع کی جگہ اور امن
اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا	بنایا، اور تم ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز
بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ	پڑھنے کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل
السُّجُوْدِ،	سے عہد کیا کہ تم دونون میرے گھر کو طواف کرنے والون
(بقرہ-۱۵)	اعتکاف کرنے والون، رکوع کرنے والون اور

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزارون برس پہلے سے خدا کے علم مین تھا، اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلعم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا، جہان کھڑے ہوکر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی، اور جو دنیا مین اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا، اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا مین عرشِ الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لئے حکم ہوا،

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، (بقرہ-۱۸) — اور تو جہان بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر،

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی جگہ کھڑا ہوکر فریضۂ عبودیت ادا کرے جہان حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہین تو کم ازکم نماز کے وقت ادھر رُخ ہی کرلے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا،

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ، (بقرہ-۱۴) — پس جدھر منہ پھیرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے،

خانۂ کعبہ کی دیوارین اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہین، نہ مشرکون، بت پرستون، اور ستارہ پرستون کی طرح نماز و دعا مین قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دیجاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانۂ کعبہ کی دیوارین اگر بالفرض ٹوٹ جائین، اس کی چھت گر جائے، اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانۂ کعبہ کے اندر جاکر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہوکر بھی نماز جائز ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو اُدھر ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے، سواری مین نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جارہی ہو پڑھ سکتے ہو، گھمسان کی لڑائیون مین بھی ایسا کیا جاسکتا ہے، یہ باتین

ان تمام مشرکانہ غلط فہمیون کی جو خانۂ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہوسکتی تھین قطعی تردید کرتی ہین، اور یہی اس باب مین دینِ محمدی کی تکمیلی حیثیت ہے،

یہ قبلہ گویا مسلمانون کا ارضی مرکز، ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موحدون کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے کا شعار، اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا، اور فرمایا کہ "جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے، وہ مسلمان ہے[1]" اگر خیال کے پر پرواز سے اڑکر اور فضائے آسمانی کی نیلگون سطح پر کھڑے ہوکر دنیا کے مسلمانون کو نماز کی حالت مین کوئی شخص دیکھے تو نظر آئیگا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس کے چارون طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت مین خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہین،

رکعتون کی تعداد ایک قیام اس کے بعد رکوع پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز مین کم از کم دو رکعتین اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئین، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشا کے وقت چار چار، اور مغرب مین تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہین رکھی گئی، اور نہ چار سے زیادہ رکعتین رکھی گئین، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل مین ذرا اثر بھی پیدا نہ ہوسکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنادے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب مین خضوع وخشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سکنڈ مین تمام ہوجاتی، اور چار سے زیادہ رکعتون کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبرا جاتا، اس لئے فرض نماز کی رکعتین دو سے کم اور چار سے زیادہ نہین رکھی گئین،

مکہ مین مسلمانون کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی، اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ چھپکر نماز پڑھتے تھے، اس کے لحاظ سے اُس وقت نماز مین زیادہ رکعتین ہونا ممکن نہ تھا، اسی لئے مکہ معظمہ مین ہر نماز فرض

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلہ،

دُو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشا میں چار چار رکعتیں کردی گئیں لیکن مسافر کے لئے وہی دُو رکعتیں[1] قائم رہیں، کیونکہ اوسکی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لئے دو اور بحالتِ خوف ایک[2] اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پران رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام وسفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا ممکن نہیں، اور صبح میں خود دو رکعتیں ہیں، ان میں کیا کمی ہوسکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دُو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی امّ المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے "مغرب میں تین اسلئے ہے کہ وہ دن کا وتر ہے، اور صبح میں دو اس لئے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کردی گئی ہے[3]"

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے، گذر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کفّار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت[4] تھا، مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کریں، اسی لئے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رکھی گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے[5]، یہ عددِ واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دُو کا عدد بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہیں، بنا بریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا، سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ وصحیح مسلم صلوۃ المسافر ومسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۱ وابن خزیمہ وابن حبان، والبیہقی (فتح الباری جلد اوّل صفحہ ۳۹۳) [2] صحیح مسلم صلوۃ المسافر،
[3] مسند احمد بن حنبل ۶ - ۲۴۱، [4] صحیح مسلم النہی عن الصلوۃ فی الاوقات الثلث، [5] عشار کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے، یعنی تین جوڑات کی وتر ہے،

ہوتی ہین، نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہین ہوتا، جو ایک رکعت ہونے مین فوت ہوجاتا اس لئے مغرب مین رکعتون کی تعداد تین رکھی گئی، اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال وانحطاط جسکو غروب کہتے ہین اسی وقت ہوتا ہے، اسلئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے، اس مفہوم کی تشریح اُس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، جس مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے،

اَوْتِرُوا یا اھلَ القرآن فانَّ اللہ وِترٌ یحبُّ الوتر۔ (ابوداؤد) — اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو، کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے،

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام اور سکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزون ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر اور مجسم کیف نظر آتا ہے، اس لئے یہ وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزون ہے، اور قرآن مجید مین اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظون مین کیا گیا ہے،

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا (بنی اسرائیل-۹) — صبح کی نماز کی قرأت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے،

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز مین رکعتون کی تعداد کے بجاے اس کی اصلی کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتین تو دو ہی رہین، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کر دیجائے، اور سورتین بڑی بڑی پڑھی جائین، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازون کی ایک رکعت مین تقریبًا پندرہ آیتین تلاوت فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز مین ساٹھ آیتون سے لیکر سو آیتون تک قرأت کرتے تھے[1]، اور اسی نسبت سے رکوع وسجود بھی ہوتا تھا[2]،

رکعتون کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلعم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے، اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثناء عامل بھی ہین، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک مین نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے، جسمین

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءۃ، [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ وتخفیفہا فی تمام۔

یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائین پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے، اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتین ہو جاتی ہین، اور مقتدیون کی جماعت کے ساتھ ایک ایک، اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشارون سے علحدہ علحدہ ادا کرتے ہین، جب نمازِ خوف مین قصر کی دو رکعتین ثابت ہوئین، تو اصل رکعتین چار ہونگی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازون مین ہے، نمازِ قصر کی آیات سورۂ نسا کے پندرہوین رکوع مین ہین،

نماز کے آداب باطنی قرآن پاک اور احادیث نبویہ مین نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہین، مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح، اور ذکر الٰہی، اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات، وآداب کو ظاہر کرتے ہین، نماز جسم و روح دونون کی عبادت ہے، اگر اس مین جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو، اور روح مین اہتزاز پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گل بے رنگ اور شراب بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی،

اقامتِ صلوٰۃ، نماز پڑھنے کے لئے قرآن پاک مین جابجا "اقامتِ صلوٰۃ" (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہین، بلکہ نماز کو اس کے آداب اور ارکان وسنن کیساتھ ادا کرنے کے ہین، چنانچہ خوف کی حالت مین جہان نماز کے بعض آداب وارکان وشرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے، فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ "پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو" اس سے معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہین کہ نماز کو اس کے تمام آداب وارکان وشرائط کے ساتھ بجا لایا جائے اس بنا پر نماز مین اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع وخشوع ملحوظ رہنا چاہئے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے،

قنوت، نماز کے آداب باطنی مین دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِیْنَ ، (بقرہ-۳۱) اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو،

صحابہ کہتے ہین کہ ہم لوگ پہلے نماز مین باتین کرلیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا، قرآن پاک مین جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت مین (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہین، چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت مین ذکر ہے، اس کے متعدد معنون مین سے ہر معنی نماز مین مقصود ہے کیونکہ نماز مین ذکر و قرأت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتون اور باتون سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس مین دیر تک قیام بھی ہے، اور عاجزی کا اظہار بھی ہے، اگر ان مین سے کوئی بھی کسی نماز مین کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف مین بھی کمی ہو جائیگی،

خشوع، تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک مین نمازیون کی یہ صفت آئی ہے،

اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ، (وہ مومنین کامیاب ہین) جو اپنی نماز مین

(مومنون-۱) خشوع و خضوع کرتے ہین،

خشوع کے لغوی معنی یہ ہین، بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھین نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا، (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی،

تبتّل، تبتل کے اصلی معنی "کٹ جانے" کے ہین، اور اس کے اصطلاحی معنی ہین خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے، مگر قرآن پاک مین جہان اس کا حکم ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورۂ مزمل

میں ہے،

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ	اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام
نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ	رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم و
عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا	بیش، اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر
سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۔ اِنَّ	ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں، بیشک
نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ	رات کو اُٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے
قِيْلًا ۭ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ	اور مؤثر ہوتا ہے، تیرے لئے دن کو بڑی
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ	فرصت ہے، اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز
تَبْتِيْلًا ۔ (مزمل-۱)	سے کٹ کر اُس کی طرف ہوجا،

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں، صحیح مسلم[1] میں حضرت عمرو بن عبسہ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت صلعم نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کرکے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی، اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جسکا وہ سزاوار ہے، اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کرلیا، (وفرغ قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہوجاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو، یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے،

تضرع، تضرع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں، (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز و الحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہئے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا،

---

[1] صحیح مسلم اول باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا،

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ط — تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کیساتھ اور دھیمی

(اعراف-۷) — آواز سے پکارو،

اخلاص، نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں، بلکہ ریا، اور نمایش ہوگی، اور بعض اہلِ حق کے نزدیک شرک لازم آئیگا، فرمایا،

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ — اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ط، (اعراف-۳) — کو اخلاص کے ساتھ پکارو،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے،

ذکر "نماز" خدا کی یاد کے لئے ہے، اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو، تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی، اسلئے فرمایا،

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ، (طٰہٰ-۱) — میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر،

ظاہر ہے کہ "یاد" صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے، اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے،

فہم و تدبر، نماز میں جو کچھ پڑھا جائے، اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا، تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لئے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کیگئی ہے، کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں، فرمایا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى — نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو،

تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ، (نساء-۷) — یہانتک کہ (اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو

اس آیتِ پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے، کہ اس میں بھی انسان فہم

اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز مین جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیونکہ اگر نیند کی حالت مین نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپکو برا بھلا کہنے لگو[1]"، دوسری روایت مین ہے کہ فرمایا "نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہئے، تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے[2]"، حاکم کی مستدرک مین ہے، کہ آپ نے فرمایا "جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے، اس کو سمجھتا بھی ہو یہانتک کہ نماز ختم کرے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ مان کے پیٹ سے پیدا ہوا[3]"

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہین جن کے بغیر نماز کامل نہین ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا، نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے، اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونون ہین،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ	پھٹکار ہو ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے
صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ، الَّذِيْنَ هُمْ	غفلت برتتے ہین، جو دکھاوے کی نماز
يُرَاءُوْنَ ، (ماعون-۱)	پڑھتے ہین،

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے "ان نمازیون پر جو اپنی نماز سے غافل ہین پھٹکار ہو" نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہین، کہ نماز کے لئے جو ظاہری آداب، مثلاً وقت کا لحاظ، اور اداے ارکان مین اعتدال وغیرہ، اور جو باطنی آداب مثلاً خشوع وخضوع، تضرع وزاری، اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہین، ان سے نماز مین تغافل برتا جائے،

---

[1] مسلم کتاب الصلوۃ باب امر من نعس فی صلاتہ جلد ا صفحہ ۲۹۳ [2] بخاری وابوداؤد ومسند احمد عن انس رض [3] مستدرک (ترغیب و ترہیب حافظ منذری جلد اول ص۳۳ مصر) اس سے ان مسلمانون کو جو عربی زبان نہین سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہئے، اور چاہئے کہ نماز مین جو سورتین اور دعائین وہ پڑھتے ہین اُن کے معنی ذہن نشین کر لین، اور یہ ہر مسلمان کے لئے بہت آسانی سے ممکن ہے، بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے،

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں جنہیں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے، ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک شخص نے آکر نہایت عجلت میں نماز پڑھی، آپ نے فرمایا: اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی" اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی، آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا، جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یارسول اللہ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا "اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قرأت کرو، اس طرح اطمینان وسکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو"[۱]

نماز میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے، اس سے انسان کی توجہ ہٹتی، اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے، اس لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "نماز میں ادھر اُدھر نہ دیکھا کرو، کیا تمھیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر پھر واپس نہ آسکے"[۲] آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے، اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے، تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے"[۳] طبرانی میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لئے کھڑا ہو، تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے، اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر اُدھر نہ دیکھو، کیونکہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو"[۴] مسند بزار میں ہے کہ "جب بندہ نماز میں ادھر اُدھر دیکھتا ہے، تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے، تو میری طرف دیکھ" دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے، پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اسکی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے"[۵]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا "سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے" صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے، فرمایا "رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا، اور خشوع نہ ہونا"[۶] ایک دفعہ آپ نے نماز سے

---

[۱] صحیح بخاری، صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ [۲] مسند احمد عن جابر بن سمرہ [۳] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۷۲ و ابوداؤد باب الالتفات فی الصلوٰۃ [۴] طبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرہ بحوالہ کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۱ [۵] کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۱۰۱ [۶] مسند احمد عن قتادہ، و دارمی باب من لا یتم الرکوع والسجود، و ابن ابی شیبہ و ابن خزیمہ و ابن حبان، و عبد ابن حمید و عبدالرزاق، و طبرانی فی الاوسط، اخبرنا لفظ العقیلی ... [illegible]

فارغ ہوکر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ "اے فلان تو خدا سے نہین ڈرتا، کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتین کرتا ہے، پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتین کرے[۱]" صحیح مسلم مین ہے کہ آپنے فرمایا کہ "کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہین پڑھتا، کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو یہ نہین سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اپنے ہی فائدہ کیلئے نماز پڑھتا ہے[۲]" نماز کی حالت مین تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے، آپنے صحابہؓ سے فرمایا کہ "نماز کی حالت مین خدا تمھارے سامنے ہوتا ہے، تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو[۳]" دوسری روایتون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز مین کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتین کرتا ہوتا ہے[۴]" مسلم کی ایک اور روایت مین ہے کہ آپنے فرمایا "نماز مین خدا تمھارے منہ کے سامنے ہوتا ہے[۵]"

نماز مین سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپنے ہدایتین فرمائی ہین، ارشاد ہوا کہ جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ، بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون، اور وقار طاری ہو[۶]" اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اُس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیون کے سکون مین خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہون تو نماز سے پہلے اُن سے بھی فراغت کرلیجائے، مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو، اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو[۷]، اسی طرح اگر استنجا یا قضاے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کرلیجائے تب نماز پڑھی جائے[۸]

---

۱ مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ جلد اوّل صفحہ ۲۳۶ (علی شرط مسلم)، ۲ صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الامر بتحسین الصلوٰۃ، ۳ صحیح مسلم کتاب المساجد باب النہی عن البصاق فیہا، و حاکم فی المستدرک و ابوداؤد، ۴ صحیح بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ و المساجد، ۵ ایضاً باب النہی عن البصاق فیہا، ۶ صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار، ۷ صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی باب کراہۃ الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام،
۸ صحیح مسلم و ابوداؤد و موطاے امام مالک و ترمذی و حاکم فی الصلوٰۃ،

آغاز اسلام مین لوگ نماز کی حالت مین ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہوگئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ نماز مین سلام کیا، اور جب آپ نے جواب نہ دیا، تو نماز کے بعد انھون نے اس کا ذکر کیا، فرمایا[1]،

اِنَّ فی الصلوٰۃ لشغلاً، نماز مین اور ہی مصروفیت ہوتی ہو،

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار مین دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے گل بوٹون کی ایک چادر اوڑھکر نماز پڑھی پھر فرمایا "اسکے گل بوٹون نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا، اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لیجاؤ اور انچانی سادہ چادر لے آو[2]" اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہ رضؓ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا آپنے نماز پڑھی تو خیالات مین یکسوئی نہ رہی، آپنے اس کو اتروادیا[3]،

نماز کے اوقات کی تعیین مین بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئین جنمین نسبتہ سکون میسر ہوتا ہو، اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہئے، تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے، اس لئے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنون مین چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لئے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے، اس لئے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو،

فانّ الصلوٰۃ مشہودۃ محضورۃ[4] کیونکہ نماز مین حضور ہوتا ہے،

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اُسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ "جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم خدا کو نہین

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ [2] صحیح مسلم باب کراہتہ الصلوٰۃ فی ثوب لہا اعلام، [3] صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس[4] صحیح مسلم باب النہی عن الاوقات الثلث،

دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے[1]"، کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز مین رقت طاری ہوجاتی تھی، اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے، ایک صحابی جنھون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہین کہ مین نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز مین ہین، آنکھون سے آنسو جاری ہین، روتے روتے ہچکیان بندھ گئی ہین، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے، یا ہانڈی ابل رہی ہے[2]

رات کی نمازون مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق وشوق کا عالم طاری ہوتا تھا، قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت وکبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم وکرم کی آیتین آتین، تو دعا کرتے[3]، آپنے فرمایا کہ" نماز دو دو رکعت کرکے ہے، اور ہر دوسری رکعت مین تشہد ہے، اور تضرع و زاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے، اور ہاتھ اٹھا کر اے رب اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا، تو اس کی نماز ناقص رہی[4]"

ایک دفعہ آپ اعتکاف مین تھے اور لوگ مسجد مین زور زور سے قراءت کر رہے تھے، آپ نے فرمایا" لوگو! تم مین سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے، تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور ایک دوسرے کی مناجات مین اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو[5]"

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ" جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمھاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو[6]" کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لیکر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتین کیا کیا ہین؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ

---

۱ صحیح بخاری کتاب الایمان، ۲ ترمذی وابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ، ۳ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۳،
۴ ابوداؤد باب صلوٰۃ النہار، و ترمذی باب ماجاء فی التخشع فی الصلوٰۃ ص۵۱ مطبوعہ دہلی، ۵ ابوداؤد صلوٰۃ اللیل،
۶ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۴۱۲ عن ابی ایوب،

انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے، اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کیساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے،

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ، (انعام۔ ۱۱)	اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ قرآن کو مانتے ہیں، اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں،

نماز کی اس نگہداشت، اور محافظت کے دو معنی ہیں، اور دونوں یہاں مقصود ہیں، یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت،

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق وتمدن ومعاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب وتہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے، مہذب ومتمدن ہوجاتا ہے، متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے، اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بنجاتا ہے،

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا شرم وحیا کی نگہداشت کے لئے، اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پرواتھے، یہانتک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج

کے لئے آتی تھین تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھین، اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھین، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہان تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اُس کے نزدیک نماز ہی درست نہین، آیت نازل ہوئی،

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف ۳) ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

مردون کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتون کے لئے پیشانی سے لیکر پاؤن تک چھپانا نماز مین ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربون کو اور جہان جہان اسلام گیا، وہان کے ہنر باشندون کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن مین پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان مین مسلمانون اور غیر مسلمانون کے لباسون پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو جا سکتا ہے کہ اسلام نے تمدّن کے اس ابتدائی سبق مین دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومین، زیب و زینت اور حسن و آرایش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بیحیائی پر اتر آتی ہین، مرد گھٹنون سے اونچا لباس اور عورتین نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہین، نماز کی بھی اصلاح کرتی ہے، اور ان متمدن قومون کو اعتدال سے تجاوز نہین کرنے دیتی، چنانچہ عورتون کو تیز خوشبو لگا کر مسجد مین جانے سے منع فرمایا، اور بے حیائی کے کپڑون کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے، اور کہدیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہین ہوتی،

طہارت ۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام مین سے ہے، اِقْرَأْ کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئی اُس مین یہ حکم تھا،

وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ، (مدثر - ۱) اور اپنے کپڑون کو پاک رکھ،

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے، اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے، اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان

کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہوں، اہلِ عرب کو دوسری وحشی قوموں کیطرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجدِ نبوی میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے، آپ نے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کیلئے یہ موزوں نہیں ہے"؛ اور صحابہ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہادو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا"؛ غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی، اہلِ عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجا، بیت الخلاء، اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں،

نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی،

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ اَنْ يَتَطَهَّرُوْا ؕ	اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ،	کہ وہ پاک وصاف رہیں، اور اللہ تعالیٰ پاک
(توبہ-۱۳)	وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے،

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کرسکتا ہے؟

صفائی

۳- نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منھ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، اُن کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا

کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں، نمازیوں کو پنجوقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا، اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے،

اہلِ عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں، جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ "اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا"

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہلِ عرب نہاتے کم تھے، اُن کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ میں تر ابور ہو جاتے تھے، اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رہتے تھے، اس لئے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے، تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اسی بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا، آنحضرت صلعم نے فرمایا،

غسل یوم الجمعۃ واجب علی کل محتلم، (بخاری کتاب الجمعۃ)	جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے،

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا، اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں فرمایا،

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا، (مائدہ ۲۰) اور اگر تم ناپاک ہوگئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ،

پابندی وقت

۴۔ انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اُس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائین، انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کامون کے اوقات جبرًا مقرر کر دیئے جائین، جیسا کہ کاروبار کے کامون مین آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کامون کے اوقات بھی ان کی لحاظ مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اُس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے، اور اُسکا وقت فضول برباد نہین ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہین، اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہین، خصوصًا نماز باجماعت کے، اُن کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہین، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہین، اور نماز کے اوقات اُن کے کامون کا معیار ہو جاتے ہین، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا اُن کے لئے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی کا مقولہ ہے،

الصلوٰۃ مکیال فمن اوفی اوفی به ومن طفف فقد علمتم ما قال اللّٰہ للمطففین — نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس سے پورا ناپا، اسکو پورا ناپ کر دیا جائیگا، اور جس نے ناپنے مین کمی کی تو تمھین کم ناپنے والون کی سزا معلوم ہے،

اس قول کے جہان اور مطلب ہو سکتے ہین، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہو، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے،

صبح خیزی

۵۔ طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہین، جو لوگ نماز کے پابند ہین وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہین کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سو یا نہ جائیگا، صبح کو وقت پر آنکھ نہین کھل سکتی، اسی لئے آنحضرت

۱؎ کنز العمال مندوبات الصلوٰۃ، جلد چہارم صفحہ ۲۳۰ بحوالہٗ مصنف عبدالرزاق،

صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نماز عشا کے بعد بے کار باتین کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے[1] تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے، اور صبح خیزی مسلمانون کی عادت ہو جائے، اور صبح کو مؤذن کی پر تاثیر آواز:-

الصلوٰۃ خیرٌ من النوم، سونے سے نماز بہت بہتر ہے،

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے،

خدا کا خوف

۶- ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے، تو رحمتِ الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگون سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہینگے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، اس کے پاؤن بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہین، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے، اور برائیون سے بچاتی ہے، اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ بے شک نماز بے حیائی اور بری باتون سے روکتی ہے۔ (عنکبوت، ۵)

ہشیاری

۷- نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیاتِ الٰہی مین تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے، اس لئے وہ تمام چیزین جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھو دین، نماز کی حقیقت کی منافی ہین، اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہین ہوئی تھی، اس کو پی کر نشہ کی حالت مین نماز پڑھنا جائز نہ تھا،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی نشہ کی حالت مین تم نماز کے قریب نہ جاؤ

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب ما یکرہ من السمر بعد العشاء،

تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (نساء - ۷) یہانتک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو،

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزون سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دین قطعاً پرہیز کریگا،

مسلمان کا امتیازی نشان

۸۔ مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونون گروہون مین کوئی امتیاز نہین کرسکتا تھا، احکام مین حج ایک ایسی چیز ہے جسکے اہل عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کرلیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس مین حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حدِ فاصل نہین ہوسکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے، اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہوسکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گران نہین ہوسکتی تھی، فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اسکا معیار نہین قرار دیا جاسکتا، کیونکہ روزہ مین چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہوسکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونون گروہون مین حد فاصل ہوسکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ مین سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا،

وَاِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی ۔ (نساء - ۲۱) اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہین تو کسلمندی کے ساتھ اٹھتے ہین،

نیز فرمایا،

وَاِنَّہَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ ۔ (بقرہ - ۵) خضوع و خشوع والون کے علاوہ وہ نماز سب پر گران ہے،

خصوصاً عشا اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

لیس صلاۃ اثقل علی المنافقین من منافقین پر فجر و عشا سے زیادہ کوئی نماز

الفجر والعشاء

گران نہین ہے،

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہین کہ "جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازون مین غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس سے بدگمان ہوجاتے تھے"[1]

مدینہ آکر نماز مین قبلہ کی تبدیلی جہان اور مصلحتون سے تھی، وہان ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہوسکے، مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منھ کرنا جائز نہین سمجھتے تھے، مدینہ مین یہود آباد تھے، جن مین کچھ مسلمان ہوگئے تھے، وہ بیت المقدس کیطرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے، اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہین کرتے تھے، اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہوسکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک مین ہے،

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا	اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہین بنایا
لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ	لیکن اس لئے تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی
عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً	کرتے ہین، اُن سے الگ کردین جو اُلٹے
إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ	پاؤن پھر جائینگے، اور یہ قبلہ گران ہوا لیکن
(بقرہ ۲-۱۷)	ان پر جنکو خدا نے راہ دکھائی،

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہیگی، اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا، اور ہمارے قبلہ کی طرف منھ کرکے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے[2]،

جنگ کی تصویر

۹۔ باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازین ہین، چنانچہ ابوداؤد مین ہے،

كان النبي صلى الله عليه وسلم و	آنحضرت صلعم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر

[1] بخاری کتاب الصلوۃ باب فضل صلوۃ العشاء فی الجماعۃ [2] مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین) جلد اول ص۲۱ و صحیح بخاری باب فضل استقبال القبلہ

جیوشہ اذا علوا الثنایا کبّروا و   چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا تو

اذا ھبطوا سبحوا فوضعت الصلوٰۃ علی ذالک۔ (ابوداؤد) تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی،

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیون (نمازیون) کی باہم محبت اور دستگیری

اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانون کو صفِ جنگ کے اوصاف

سکھاتی ہے، اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑون مین پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت

دھوپ کی شدت مین گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیون سے وقت نکال کر

خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا و زاری کر لینا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری مین

مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہین کہ ہم فرضی راحت وتکلیف سے بے پروا ہوکر، عمل کی طاقت اپنے مین

پیدا کرین، اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھین اور اس کے

لئے عارضی تکلیفون کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائین، ہفتہ مین ایک دن نمازِ جمعہ کے لئے شہر کے سب

مسلمانون کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پرآرام سے پرآرام وقت مین ممکن تھا، مگر اس کے لئے بھی

دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ مین بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہین، اور

نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دیگا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلاتِ وقت کے اتفاقات مین اس کے

لئے کس قدر مُمِدّ ثابت ہوتی ہے،

دائمی تنبّہ اور بیداری

۱۰- تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیلِ اخلاق ہے، لیکن اصلاحِ اخلاق کا سب سے بڑا

ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار، اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے، تمام عبادات مین صرف نماز ہی

ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہین ہین، اس کے

ساتھ روزہ سال مین ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر مین ایک بار ادا کرنا پڑتا

ہے، اس لئے یہ فرائض نفس کے تنبّہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہین ہو سکتے، برخلاف انکے

نمازون مین پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام و قعود، جہر، خفا، تسبیح و تہلیل، تکبیر و تشہد نے اس کے ارکان و اعمال مین تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے، جنمین ہر چیز نفس مین تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے، اور ہر چوبیس گھنٹہ مین چند گھنٹون کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تنبّہ ہوا کرتا ہے،

الفت و محبت

۱۱- نماز مسلمانون مین باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن مین پانچ دفعہ جمع ہون، اور باہم ایک دوسرے سے ملین تو ان کی بیگانگی دور ہوگی، ان مین آپس مین محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہین گے، قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے،

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا	خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو، اور مشرکون
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا	مین سے نہ ہو، ان مین سے جنھون نے اپنے دین
دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ (روم-۴)	مین پھوٹ ڈالی، اور بہت سے جتھے ہو گئے،

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانون کو جتھا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہیگی، تو غلط فہمیون کا موقع کم ملیگا،

غمخواری

۱۲- بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانون مین باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جب امیر و غریب سب ایک جگہ جمع ہونگے، اور امرا اپنی آنکھ سے غریبون کو دیکھین گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی، اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی،

ابتدائے اسلام مین اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا، یہ گروہ مسجد مین رہتا تھا، صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لیجا کر مسجد مین لٹکا دیتے تھے جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہ اور خود آنحضرت صلعم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگون کو

ساتھ لاتے اور اپنے گھرون مین کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہین، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مین نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے،

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ ، (بقرہ-۱) — اور نماز قائم کرتے ہین، اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس مین سے صرف کرتے ہین،

اجتماعیت

۱۳- اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لئے تمام قومون نے اس کے لئے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہین، جن قومون کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان مین بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبون، کانفرنسون، اینیورسریون، اور دوسرے جلسون، جلوسون، اور مظاہرون سے کیجاتی ہے لیکن یہ اجتماعیت جہان فائدے پہنچاتی ہے، وہان اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہوا تو وہی رنگ رلیون، رقص و سرود، شراب خواری، قمار بازی، چوری، بدنظری بدکاری، رشک و حسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالین عرب مشرکون مین بھی ملتی تھین، اور اب بھی ملتی ہین، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہون اور فسادون کا مرکز بنجاتے ہین، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے، اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رخ کی طرف بہے، چنانچہ اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازین ہفتہ مین جمعہ کی نماز اور سال مین دو دفعہ عیدین کی نمازین مقرر کین، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو، اور مشرکانہ بدیون اور اخلاقی برائیون سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے، حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع مین دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ مین توبہ و انابت کو قرار دیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور

اخلاصِ عمل کی بنیاد پر قائم ہے،

کامون کا تنوع

۱۴۔ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن، اور تجدد کا طالب ہی، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام مین مصروف رہین، تو سکون و اطمینان، عیش و راحت، اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اُٹھے، اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے جس مین انسان کو حرکت وسکون دونون کا یکسان موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی مین شمار کیا گیا ہی، کہ اس تغیر و تبدل سے نظامِ عالم مین نیرنگی پیدا ہوتی ہے، اور اس تقسیم سے انسانون مین اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے، اور نہ سال مین ایک دفعہ یا عمر بھر مین صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آکر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی، اور عصر پر پہنچکر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازین خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشا پر جاکر منتہی ہوئی، اب نیند آگئی، اور صبح تک بیخبری رہی، اٹھے تو دعاؤن کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولتمند جو جسمانی یا دماغی محنت ومشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہین حاصل کرتے، وہ اس روحانی "انٹرول" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہین، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹون تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ مین ہاتھ منھ دھوکر دعا وتسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کرلی،

تربیت

۱۵۔ انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے، کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات واخلاق کی اُستواری، اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام مین اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن مین کئی دفعہ ہو

نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بارسے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان مین، استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے، اس لئے انسان مین اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھکر کوئی اور چیز نہین ہوسکتی، اس لئے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح مین کہا،

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج-۱) وہ جو اپنی نماز مداومت کیساتھ ادا کرتے ہین،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

احبُّ العمل الی اللہ ادومہ وان قلّ، (ابوداود باب ما یومر بہ من القصد فی الصلوٰۃ) محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو،

نظم جماعت

۱۶- کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہین رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہوجاتا ہے، اسلام مین نماز با جماعت مسلمانون کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربون کے سامنے پیش کرکے اُن کی زندگی کا خاکہ کھینچا، اور بتایا کہ مسلمانون کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا، اور یکسان حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظامِ جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ "جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمہارے دل بھی آپس مین نہ ملین گے[1]"

مساوات

۱۷- یہی جماعت کی نماز مسلمانون مین برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے، یہان امیر و غریب، کالے گورے، رومی حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہین ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ وبعدہا و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف،

ایک صف مین کھڑے ہوکر خدا کے آگے سرنگون ہوتے ہین، جماعت کی امامت کے لئے حسب ونسب، نسل وخاندان، رنگ روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہین ہوتی، بلکہ علم و دانش فضل وکمال اور تقویٰ وطہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہان شاہ وگدا، اور شریف ورذیل کی تفریق نہین، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے پیچھے، ایک صف مین دوش بدوش کھڑے ہوتے ہین، اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہین ہٹا سکتا، اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن مین پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانون کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہین اور بھی قائم ہے؟

مرکزی اطاعت

۱۸- جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانون کی اس زندگی کا رمز ہے، کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہین، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کیلئے بانگِ درا اور صدائے جرس ثابت ہو،

اطاعتِ امام کے لئے ایک طرف تو قوم مین فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے، جس کی تعلیم مقتدیون کو نماز مین ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاقِ صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگون کے پیش نظر رہے، نماز ان دونون چیزون کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے، جو قوم کے اعضا وجوارح کو ہر وقت اطاعت گذاری کے لئے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نماز پنجگانہ اور جمعہ و عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزون ہین جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہین، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش وعشرت مین مصروف ہو، نماز صبح مین شریک نہین ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کرکے شریکِ جماعت ہونا پسند نہین کرسکتا، چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ

کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا، اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کین، احادیث مین بھی اس زمانہ کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا ہے، جس مین ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے مین غفلت کرینگے

معیار فضیلت

۱۹- نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقوی کے کوئی اور قید نہین ہے، اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ جماعت مین جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرء) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان مین سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہین انھین کو قرآن زیادہ یاد ہے، چنانچہ آپ نے انھین کمسن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگون مین اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے،

روزانہ کی مجلس عمومی

۲۰- آنحضرت صلعم اور خلفاے راشدین کے زمانہ مین یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانون مین منادی کرائی جاتی تھی کہ الصّلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے، اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانون کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا، جس کے لئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل و سستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا،

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار، اور اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانون کا شیرازہ بندھا تھا، اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانون کے ہر قومی اجتماع کا مرکز، اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی جس طرح

آج ہر جلسہ کا افتتاح اُس کے نصب العین کے اظہار و تعیین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے اُن کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اُس کے تابع اور اسی کے زیرِ نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دار الامارۃ تھا، وہی دار الشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ، اور وہی معبد تھا،

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے، اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا، اور اختلافِ باہمی کو نہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت مین فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرِ لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انھین رموز و اسرار کا گنجینہ ہے' یہ مسلمانون کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبری، اور وحدتِ قوّت کا سبق دن مین پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لئے اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہین، اور نہ اسکی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیادِ امامت ہے، نہ زندگی ہے، اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعیِ اسلام علیہ السلام نے یہ فرما دیا،

العہدُ الذی بیننا وبینھم الصلوٰۃ فمن ترکھا فقد کفر، (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)	ہمارے اور اُن کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے اسکو چھوڑا، اُس نے کفر کا کام کیا،

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالبِ بے جان، شراب بے نشہ اور گلِ بے رنگ و بو ہو کر رہجاتا ہے، اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اُس سے رخصت ہو جاتی ہے، اسی لئے نماز اسلام کا اوّلین شعار ہے، اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے،

عرب کی روحانی کایا پلٹ

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھون نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہین دیکھا تھا، وہ جس کی

روح ربّانی تسکین و تسلّی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دفعۃً گیا ہو؟ اب عبادتِ الٰہی اوسکے ہر کام کا مقصد بن گئی، اب اس کو اپنے ہر کام مین اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہین چاہتی تھی، اُس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہین آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا، اُس کی آنکھین اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھین، اس کی روح یادِ الٰہی کی تڑپ اور ذکرِ الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلّی نہ پاتی تھی،

دل راکہ مردہ بود حیاتے زنو رسید　　تا بوے از نسیم مَیَش در مشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی، کہ

وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا (نساء-۲۱)　　اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں،

دعوتِ حق اور فیضِ نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایان کی، کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتین بھی اُن کو ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کر سکین،

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ، (نور-۵)　　ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہین کرتا،

اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال مین ان کے اندر خدا کی یاد کے لیے بیقراری تھی،

یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ، (آل عمران-۲۰)　　جو خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہین،

راتون کو جب غافل دنیا، نیند کے خمار مین ہوتی، وہ بسترون سے اُٹھکر خدا کے سامنے سربسجود اور راز و نیاز مین مصروف ہوتے تھے،

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ　　جن کے پہلو (رات کو) خوابگاہون سے علٰحدہ

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا، (سجدہ ۷-۲) — رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں،

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا یَرْكَعُوْنَ، (مرسلات-۲) — اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے،

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (فتح-۴) — تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کی تلاش کرتے ہیں

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی، کہ

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ج (زمر-۵) — اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو اُن کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، مکدر ہو جاتے ہیں،

آفتاب نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیت الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا،

اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (انفال-۱ و حج-۵) — وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں،

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ؐ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں، یا تجارت، یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا، تو یہ شغل وعمل اُن کو یاد الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو

پوری طرح ادا کرتے تھے[1]، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی، دیکھا کہ صحابہؓ نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے[2]،

صحابہؓ تمام تمام راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے، یہانتک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے، خدا نے گواہی دی،

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ	بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات
ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ	کے قریب، اور آدھی رات اور ایک تہائی رات
مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط	کے بعد اٹھتا ہے، اور تیرے ساتھ ایک جماعت
(مزمل - ۲)	بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے،

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا، جلوۂ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے اس والہانہ اندازِ عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اسطرح ادا کی ہے،

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لا الَّذِيْ	اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات
يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ لا وَتَقَلُّبَكَ فِي	کو جب تو نماز کے لئے اٹھتا ہے، اور سجدہ میں
السّٰجِدِيْنَ، (شعراء - ۱۱)	پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا،

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَاَفْشُوا	اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ، اور سلام کو پھیلاؤ

[1] صحیح بخاری باب التجارۃ فی البز وغیرہ۔ [2] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۲۵۳ بحوالہ عبد الرزاق،

السّلامُ وصلّوا والناس نیامٌ (ترمذی)   اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں،

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انھون نے راتون کا سونا چھوڑ دیا، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان لوگون کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا، چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز مین مصروف رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان سے فرمایا کہ "عثمان! تمھارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"[1] حضرت ابن عباسؓ کہتے ہین کہ صحابہ راتون کو اُٹھ اُٹھ کر نماز پڑھتے تھے، اور بہت کم سوتے تھے[2]، حضرت ابو ہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک مین خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے مین اُن کی بیوی، اور تیسرے مین ان کا غلام، اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا[3]، حضرت عبد اللہؓ بن عمرو ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت[4] فرمائی، حضرت ابو دردأؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز مین گذار دیتے تھے، حضرت سلمانؓ فارسی اُن کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ اُن کے ہان جا کر مہمان ہوئے، جب رات کو حضرت ابو دردأؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا، پچھلے پہر جب سنّاٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا، کہ اب نماز کا وقت[5] ہے، کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو، یہانتک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت مین بھی وہ اس فرض سے غافل نہین رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پر خطر کام کے لئے کہین بھیجا تھا، جب وہ منزلِ مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، ان کو خوف تھا کہ اگر کہین ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا، تو وقت نکل جائے گا، اور اگر عصر مین تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل مین دیر ہو جائے گی، اس مشکل کا حل انھون نے اس طرح کیا، کہ وہ اشارون مین نماز پڑھتے جاتے اور چلتے

[1] ابو داؤد باب القصد فی الصلوٰۃ [2] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبی صلعم من اللیل [3] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الحشف، [4] صحیح بخاری کتاب الصوم، [5] صحیح بخاری کتاب الصوم،

جاتے تھے[1]، سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز اُن سے ترک نہیں ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دو سروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے[2]، پھر وہ جس خضوع و خشوع، محویت اور استغراق کیساتھ نماز ادا کرتے تھے، اس کا نظارہ بڑا پُر اثر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو اُن پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی، کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا[3]، حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے، کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی[4]، حضرت تمیمؓ داری ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی، بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے[5]، ع شب شد و صبح و ہمان محوِ تماشا باشم، حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے، کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں[6]، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے، اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کوئی ستون کھڑا ہے، اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے، کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطحِ جامد سمجھکر ان کی پیٹھ پر آکر بیٹھ جاتے تھے[7]،

ایک رات میدانِ جنگ میں ایک پہاڑی پر ۲ دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں، ایک صاحب سو جاتے ہیں، اور دوسرے نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہیں، مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں، ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا، جواب ملتا ہے، میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دوں[8]

---

[1] ابو داؤد باب صلوٰۃ الطالب، [2] نسائی، کتاب الامامہ باب المحافظۃ علی الصلوٰۃ، [3] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب اذا بکی الامام فی الصلوٰۃ، [4] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ، و کتاب الصلوٰۃ، باب المسجد یکون فی الطریق، [5] اسد الغابہ تذکرۂ حضرت تمیمؓ داری، [6] صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین، [7] حالات عبداللہ بن زبیرؓ، اصابہ و اسد الغابہ وغیرہ، [8] ابو داؤد کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم،

اس سے بھی زیادہ پُراثر منظر یہ ہے کہ دشمنون کی فوجین مقابل کھڑی ہین، تیرون کا مینھ برس رہا ہے، نیزون اور تلوارون کی بجلیان ہر طرف کوندرہی ہین، سروگردن، دست و بازو کٹ کٹ گر رہے ہین، کہ دفعۃً نماز کا وقت آجاتا ہے، فوراً جنگ کی صفین نماز کی صفین بنجاتی ہین، اور ایک اللہ اکبر کی آواز کیساتھ موت وحیات سے بے پروا ہوکر گردنین جھکنے اور اٹھنے لگتی ہین،

نور کا تڑکا ہے، اسلام کے دائرہ کا مرکز، فاروقِ اعظم امام نماز ہے، پیچھے صحابہ کی صفین قائم ہین، دفعۃً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے، اور خلیفہ پر حملہ آور ہوکر شکم مبارک کو چاک چاک کردیتا ہے، آپ غش کھاکر گر پڑتے ہین، خون کا فوارہ جاری ہوجاتا ہے، یہ سب کچھ ہورہا ہے مگر نماز کی صفین اپنی جگہ پر قائم ہین، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہین، پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہولیتا ہے تب خلیفۂ وقت کو اٹھایا جاتا ہے[۱]،

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز مین زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگون نے ان کو نماز کے لئے جگایا، تو بولے "ہان جو شخص نماز چھوڑدے، اسلام مین اس کا کوئی حصہ نہین"، چنانچہ اسی حالت مین کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی[۲]،

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لئے مسجد مین داخل ہوتے ہین، یا صبح کی نماز مین ہوتے ہین[۳] کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کرتی ہے، اور کچھ دیر کے بعد وہ داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہین، امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان مین رونق افروز ہوتے ہین، عزیزون اور دوستون کی لاشین میدان جنگ مین نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہین ہزارون اشقیا آپ کو نرغہ مین لئے ہوتے ہین، اتنے مین ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنون سے اجازت چاہتے ہین، کہ وہ اتنا موقع دین کہ آپ ظہر کی نماز ادا کرسکین[۴]،

---

[۱] صحیح بخاری واقعۂ شہادت عمرؓ، [۲] موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم [۳] الریاض النضرۃ للمحب الطبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۶، مصر، [۴] تاریخ طبری کبیر ص ۲۳۴۷ ج ۷، واقعات سنہ ۶۱ھ،

نماز مین جس خضوع و خشوع کا حکم ہے، صحابۂ کرامؓ نے اس کے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر اُن کے اس روحانی ذوق و شوق مین خلل انداز ہوئی، تو انھون نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا، حضرت ابوطلحہ انصاری اپنے باغ مین نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آکر چہچہانا شروع کیا، حضرت ابوطلحہؓ دیر تک ادھر اودھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی، دل مین کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا، یہ کہکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باغ راہِ خدا مین نذر ہے،

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ مین نماز مین مشغول تھے، باغ اُس وقت نہایت سرسبز و شاداب اور پھلون سے لدا ہوا تھا، پھلون کی طرف نظر اٹھ گئی، تو نماز یاد نہ رہی، جب اُس کا خیال آیا تو دل مین نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا اُن کی خدمت مین حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ مین مبتلا کر دیا راہِ خدا مین دیتا ہون چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار مین فروخت ہوا[1]،

[1] یہ دونون واقعے موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب ما یشغلک عنہا مین مذکور ہین،

زکوٰۃ

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے، اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظامِ جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن **زکوٰۃ** ہے، جو آپس مین انسانون کے درمیان ہمدردی، اور باہم ایک دوسرے کی امداد، اور معاونت کا نام ہے، اور جس کا اہم فائدہ نظامِ جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام **صدقہ** ہے، جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے، لیکن فقہی اصطلاح مین "زکوٰۃ" صرف اُس مالی امداد کو کہتے ہین، جو ہر اُس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو،

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب مین زکوٰۃ بھی اُن عبادات مین سے ہے، جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفون مین فرض بتائی گئی ہے، لیکن اُن کے پیرو دن نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا، کہ بظاہر اُن کے مذہبی احکام کی فہرست مین اس کا نام بھی نظر نہین آتا، حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفون سے ہوتی ہے، کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے، بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا، اس مین نماز اور زکوٰۃ دونون ہین،

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ (بقرہ-۱۰) (ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ،

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ (مائدہ-۳) (اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے زکوٰۃ

حضرت اسمٰعیلؑ کے ذکر مین ہے،

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ	اور قرآن مین اسمٰعیل کا ذکر کر، بے شک وہ وعدہ
صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۔ وَ	کا سچا تھا، اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا، اور وہ اپنے
كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ	لوگون کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا، اور وہ اپنے
وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ، (مریم۔۴)	رب کے نزدیک پسندیدہ تھا،

حضرت عیسیٰؑ کہتے ہین،

وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ	اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ
حَيًّا ، (مریم۔۲)	دینے کی تاکید کی،

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانورون مین ایک عشر یعنی دسوان حصہ (احبار ۲۷-۳۰-۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا، (خروج ۳۰-۱۳-۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج کھلیان کی منتشر بالین اور پھل والے درختون مین کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کیجاتی تھی، اس کا ساٹھوان حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسوان حصہ حضرت ہارونؑ کی اولاد (لاویین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی، اور ہر تیسرے سال مین دسوان حصہ بیت المقدس کے حاجیون کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافرون، غریبون، بیوا‌ؤن اور یتیمون کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا[۱]، اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم، جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی[۲]،

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد مین کوئی ترمیم نہین کی،

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برطانیکا طبع یازدہم مضمون "خیرات" (CHARITY) باب یہودیون مین خیرات" [۲] توراۃ خروج ۳۰-۱۶ و ۳۸-۲۶

بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا، انجیل لوقا (۱۸-۱۰) مین ہے کہ "جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمایش، اور فخر کے لئے دیتا ہے اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے"۔ اسی انجیل کے ۲۱ وین باب کی پہلی آیت مین ہے کہ

"اگر کوئی دولتمند ہیکل کے خزانہ مین اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے، اور اس کے مقابلہ مین کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے، تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہین بڑھ کر ہے"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگون کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ مین لٹا دے،

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے، مگر دولتمند کا خدا کی بادشاہت مین داخل ہونا مشکل ہے، (متی ۱۹-۲۴)

ساتھ ہی انھون نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے، (متی ۱۷-۲۴)

توراۃ کے زمانہ مین چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانورون کے گلون تک محدود تھی، اس لئے انہین دونون چیزون کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور اُن کے سکّون کی چونکہ قلت تھی اس لئے اُن کی زکوٰۃ کا ذکر ایک ہی دو جگہ ہے، اسی بنا پر یہودیون نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہین کی، علاوہ برین زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے، تصریحاً معلوم نہین ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہان خرچ کیجائے اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے،

غرض وجوہ جو کچھ ہون، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا، اور خصوصاً عرب مین جہان کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ، (بقرہ ۸-۱۰)

(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے مگر تم مین سے تھوڑے اور تم دھیان نہین دیتے،

عیسوی مذہب مین گو سب کچھ دینے کا حکم تھا مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزون نہین ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا۔ دوسرے مذہبون مین بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہین کیا گیا تھا، اور نہ ہر شخص پر قانونًا کوئی رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا،

اسلام کی اس راہ مین تکمیل محمد رسول اللہ صلعم کی شریعت نے اس بارے مین بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا، اس نے نہایت خوبی اور دقتِ نظر کے ساتھ، زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا، انسان کے مالی کاروبار کا معیار عمومًا سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی، اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا چاندی اور جانور اور پیداوار، اور ان مین سے ہر ایک کی علحدہ علحدہ شرحین مقرر کین، سونے چاندی مین چالیسوان حصہ اور پیداوار مین دسوان حصہ متعین کیا، جانورون کی مختلف قسمون مین ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحین قرار دین، پھر اس زکوٰۃ کے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا،

یہ تو اجمال تھا، اب تفصیلی حیثیت سے اُن مین سے ہر ایک پہلو پر شریعتِ محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایان کرنا ہے،

اسلام مین زکوٰۃ کی اہمیت اسلام کی تعلیم، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحیفۂ وحی مین نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوقِ الٰہی مین سے ہے، اور زکوٰۃ حقوقِ عباد مین

ان دونون فریضون کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے، کہ اسلام مین حقوق اللہ کے ساتھ حقوقِ عباد کا بھی یکسان لحاظ رکھا گیا ہے، قرآنِ پاک مین جہان کہین نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآن پاک مین بیس مقامات پر "اقام الصلوٰۃ" کے بعد ہی ایتاء الزکوٰۃ، آیا ہے، مثلاً اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ یا اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والون کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام مین زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے، بارگاہِ نبوی مین آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہین، تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان مین اس قسم کی متعدد حدیثین ہین جنمین یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائطِ بیعت مین داخل کی گئی ہے، چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کہتے ہین کہ "مین نے رسول اللہ صلعم سے بیعت تین باتون پر کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا" وفد عبد القیس نے ۹ھ مین نبوت کے آستانہ پر حاضر ہوکر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو آپ نے اعمال مین پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی،

۹ھ مین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ "پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ یہ جان لین تو ان کو بتانا کہ دن مین پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لین تو انھین بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولتمندون سے لیکر اُن کے غریبون کو دی جائیگی، صحابہؓ مین جو لوگ شریعت کے راز دان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کے خلاف تلوار کھینچ لی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا

[1] یہ دونون حدیثین صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ۱۸۷ مین ہین، [2] صحیح بخاری جلد دوم ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ،

کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہین، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ مین فرق کریگا مین اس سے لڑونگا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم! جو رسول اللہ صلعم کے زمانہ مین بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑیگا[۱]" حقیقت مین یہ ایک لطیف نکتہ تھا جسکو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا[۲]، اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی،

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادون پر قائم ہے، جن مین سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے، اسلام کا نظام روحانی نماز باجماعت سے جو کسی مسجد مین ادا ہو، قائم ہوتا ہے، اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال مین جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونون چیزین، اسلام مین ساتھ ساتھ نظر آتی ہین، اور ان کی انفرادی حیثیت کیساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدیؐ نے خاص زور دیا ہے، نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے، لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے، اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے، مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہین یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت مین جب بعض قبیلون نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال مین داخل نہ کرین گے بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دین گے، تو شریعت محمدی کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہین کیا، اور بزور ان کو بیت المال مین زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لیجاتی، تو اسلام کی وحدت کا سر رشتہ اسی وقت پارہ پارہ، اور مسلمانون کی امامت وجماعت کا نظام

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص۱۸۸، [۲] درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی، فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ..... فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، (توبہ - ۱۰) ان مشرکون کو مارو جہان پاؤ . . . . تو اگر وہ توبہ کرین اور نماز کھڑی کرین، اور زکوٰۃ دین تو ان کو آزادی دے دو، نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص۱۰۹۶ باب کراہیۃ الاختلاف،

اسی وقت درہم برہم ہو جاتا،

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ مین غریبون کی چارہ گری، مسکینون کی دست گیری، مسافرون کی امداد، یتیمون کی خبرگیری، بیواؤن کی نصرت، غلامون اور قیدیون کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے، اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ مین نظر آتی ہے،

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آکر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتداے اسلام ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا، بعض مورخون اور محدثون کو اس بنا پر کہ سنہ مین زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات مین جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے، حالانکہ شروع اسلام مین زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مرادف تھا، اس کی مقدار، نصاب، سال، اور دوسری خصوصیتین جو زکوٰۃ کی حقیقت مین داخل ہین، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظون سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیون کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم "نماز" اور دوسرے کا "زکوٰۃ" ہے، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق جب بلند ہوئی، تو اس پکار کی ہر آواز، انہین دو لفظون کی تفصیل و تشریح تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بعثت سے پہلے غارِ حرا مین چھپ کر خدا کی یاد (نماز) مین مصروف رہتے تھے، اسی طرح بیکس اور لاچار انسانون کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے بعثت کے وقت آپ کی نسبت فرمایا، "آپ قرابتدارون کا حق پورا کرتے ہین، قرضدارون کا قرض ادا کرتے ہین، غریب کو کماتے ہین، مہمان کو کھلاتے ہین، لوگون کو مصیبتون مین مدد دیتے ہین[1]" غور کرو کیا زکوٰۃ انہین فرائض کے مجموعہ کا نام نہین ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہین، اور انہین دو اجمالی

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اول،

حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے،

سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین مین وہ تمام بیج موجود ہین، جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، اس مین نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ مین ادا کیا گیا ہے،

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، (مدثر-۱) اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر،

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ مین موجود ہے، اس کے بعد ہے،

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرْ، (مدثر-۱) اور بدلا بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر،

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہین، مدثر کے بعد سورۂ مزمل اتری اس مین بہ تصریح دونون حکم موجود ہین، اور زکوۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کیگئی ہے،

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَأَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ... (مزمل-۲) اور نماز کھڑی کرو، اور زکوۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو، اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب مین زیادہ پاؤگے،

بعثت کے پانچوین سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کرکے حبشہ گئے ہین، اور نجاشی نے اپنے دربار مین بلاکر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہین، اور حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب مین جو تقریر کی ہے، اس مین ہے، "اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھین، روزے رکھین، اور زکوۃ دین"[1] اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی مین ہوچکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جو تقریبا ۵ھ مین آیا تھا) سوال کے جواب مین آپ نے جن احکام کی تعلیم دی، ان مین ایک زکوۃ بھی تھی[2] اور ۶ھ مین جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد، ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے

[1] مسند احمد جلد اول صفحہ ۲۰۲، [2] صحیح بخاری کتاب الزکوۃ،

اسلام کی تعلیمات دریافت کین تو انھون نے دوسری چیزون کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ کا بھی[1] تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۵ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی،

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تعلیم صرف نظریون کا پیش کرنا نہ تھا، بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا، اس لئے حالات کے اقتضار اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزار اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی، مکہ معظمہ مین مسلمانون کی پریشانی پراگندگی، شکستہ حالی، اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی اُن کے لئے بہت تھا، کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دین، چنانچہ اس زمانہ مین اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی،

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ، اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ، يَتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ، اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ، (بلد-۱)	اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے، کسی (قرضدار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن مین ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو، یا خاک مین پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا،

عام قریش پر جنھون نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہین سنا، عتاب آیا،

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ، (ماعون-۱)	وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہین کرتا،
كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ، (فجر-۱)	یہ بات نہیں، بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہین کرتے اور آپس مین محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے،

---

[1] صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ و کتاب التفسیر،

اور مسلمانون کے اخلاص، باہمی ہمدردی، اور ان کے جذبۂ ترحم کی تعریف فرمائی، کہ

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ — اور وہ (حاجتمند ہونے کے باوجود) محتاج یتیم اور

يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا، اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ — قیدی کو کھانا کھلاتے ہین (اور کہتے ہین) کہ ہم تم کو

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا، — صرف خدا کے لئے کھلاتے ہین، تم سے نہ بدلا چاہتے

(دھر-۱) — ہین نہ شکریہ،

مدینہ منورہ آکر جب مسلمانون کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انھون نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ مین صدقۃ الفطر واجب ہوا[۱] یعنی یہ کہ سال مین ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ مین خیرات کرے، تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گذارین، اس کے بعد مسلمانون کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کیگئی، انھون نے دریافت کیا، یارسول اللہ! ہم کیا خیرات کرین،

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، (بقرہ ۲-۲۷) — وہ پوچھتے ہین کہ وہ کیا خیرات کرین،

ارشاد ہوا،

قُلِ الْعَفْوَ، (بقرہ ۲-۲۷) — کہدو (اے پیغمبر) کہ تمھاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے، (اسکو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ مین اسلام کا پہلا قدم ہے، صحیح بخاری مین حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانون کو یہ حکم تھا، کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ مین خیرات کردین، آیندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھین،[۲] کہ اس وقت اسلام اور مسلمانون کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنون کے بعد جب مسلمانون کو فتوحات نصیب ہوئین، زمینین اور جاگیرین ہاتھ آئین، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا،

[۱] تاریخ طبری طبع یورپ صفحہ ۱۲۸۱،
[۲] بخاری کتاب الزکوٰۃ مع فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۲۱۶

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ،

اے مسلمانو! اپنی کمائی مین سے کچھ اچھی چیزین، اور جو ہم تمھارے لئے زمین سے پیدا کرین، اسمین سے کچھ خیرات مین دو، (بقرہ - ۳۷)

مسلمانون نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ،

اور ہم نے اُن کو جو روزی دی ہے اس مین سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہین، (بقرہ - ۱)

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ مین کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے، چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے، تو غریب و نادار صحابہؓ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت مزدوری کرکے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے، اور دوسرون کو بھی صدقہ دے، انھون نے پھر گذارش کی کہ جس مین اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، انھون نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا "تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے یہی اُسکا صدقہ ہے"[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پُر اثر تعلیمات اور نصیحتون کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جاکر بوجھ اٹھاتے تھے، اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ مین خرچ کرتے تھے،[2]

لیکن باین ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہین ہوا تھا، اور اس لئے اُسکا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان ۸ھ مین مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ مین منسلک کردیا، اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ

(اے محمد رسول اللہ) ان کے مال مین سے

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوۃ، [2] ایضاً،

وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ،   صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اسکے ذریعہ سے تم ان کو

(توبہ-۱۳)   پاک وصاف کرسکو،

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ مین زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے، اس کی وصولی کے لئے تمام عرب مین محصلون اور عاملون کا تقرر ہوا[1]، اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام و قوانین سورۂ برأت مین مذکور ہین، جو ۹ھ کے آخر مین نازل ہوئی ہے،

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین مین بڑی افراط و تفریط تھی، توراۃ مین جو عُشر یعنی دسوان حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال مین ایک دفعہ واجب ہوتا تھا، (استثنا ۱۴-۲۸) اور انجیل مین کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی، اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ مین سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا، کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ مین واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اُس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو، اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبون مسکینون اور قابلِ امداد لوگون کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ مین دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینون کا سال مقرر کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے، اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلون کی صنعتی صورت کا بنانا اور اُن کا بیوپار کرنا ہے، آمدنی کے ان تمام ذریعون کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلین، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف، گذر جائین تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع و نقصان کی میزان لگ سکے، اور زمیندار، کاشتکار، تاجر، نوکر، صناع، ہر ایک اپنی آمدنی و سرمایہ کا حساب کتاب کرکے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے، بڑے جانورون کی پیدایش اور نسل

---

[1] ابن سعد جلد مغازی صفحہ ۱۱۵ و تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۷۲۲ مطبوعۂ یورپ،

کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال لگتا ہے، ان تمام وجوہ سے ہر منظم جماعت، ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے، شریعتِ محمدی نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے، اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے، چنانچہ اس کا کھلا ہوا اشارہ سورۂ توبہ میں موجود ہے، جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں، زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے،

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ	مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں
شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ	جس دن اللہ نے آسمانوں کو اور زمین
وَالْاَرْضَ، (توبہ - ۵)	کو پیدا کیا،

زکوٰۃ کی مقدار | توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار، پیداوار کا دسواں حصہ تھا، اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر و غریب سب پر یکساں فرض تھا، لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے، اور کہیں نہر کے پانی سے، جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہوجاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں، بعض مرتبہ دولت بے محنت، مفت ہاتھ آجاتی ہے، اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہوسکتا، انجیل نے حسبِ دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی شریعتِ کاملہ نے علم اقتصادِ سیاسی (پولیٹیکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کردی، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعتِ محمدیہ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدمِ تعیین، دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کرلیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دیدی، کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم و بیش جو چاہے، اور جب چاہے خدا کی راہ میں دیدے، اس کا نام

۱؎ بکری کی مدت حمل چھ مہینے، گائے کی نو، اونٹ کی گیارہ، اور بھینس کی بارہ مہینے ہے،

انفاق یا عام خیرات و صدقہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت مین غریبون اور محتاجون اور دوسرے نیک کامون کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے، اور اس کا نام زکوٰۃ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک مین فرمایا،

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ دَآىِٕمُوْنَ ۙ وَ	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہین، اور جن کے مالون
الَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۙ لِّلسَّآىِٕلِ	مین مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ ہے،
وَ الْمَحْرُوْمِ ۙ (معارج-۱)	

اس آیت سے صاف و صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانون کی دولت مین غریبون کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے، چنانچہ قرآنِ پاک مین مَعْلُوْم اور مَعْلُوْمَاتِ کے الفاظ جہان آئے ہین، وہان یہی مقصود ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عرب مین جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا، عرب مین اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جس کا حکم توراۃ مین مذکور ہے، اور اس کی شرح بھی اس مین مقرر ہے یعنی پیداوار مین دسوان حصہ، اور نقد مین نصف مثقال، آنحضرت صلعم نے اپنی حکمتِ ربانی سے اجناسِ زکوٰۃ پر مختلف شرحین مقرر فرمائین، جو قیمت کے لحاظ سے اسی "شرحِ معلوم" کے مساوی ہین، اور ان شرحون کو فرامین کی صورت مین لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوینِ حدیث کے زمانہ تک بعینہ محفوظ تھے، اور تدوینِ حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتبِ حدیث مین درج کیا گیا جو آجتک موجود ہین،

اس تمام تفصیل کا مخرج قرآنِ پاک مین بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے،

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے، اور جیسے جیسے محنت بڑھتی، اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے، زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے، عرب مین یہ دستور تھا کہ قبیلون کے سردار

چوتھ وصول کرتے تھے، اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو مرباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے، شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو، ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا، مگر چونکہ اسلام کو محکومان اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدنظر تھی، اس لئے اُس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھ (¼) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور اُن کے بعد اُن کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل و عیال کے نان و نفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کر سکیں،

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے "خمس" ہے، قرآن نے کہا،

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ	اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں
خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی	حصہ خدا کے لئے، اور رسول کے لئے اور قرابتمند
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ	کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر
(انفال - ۵)	کے لئے ہے،

نکتہ، اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں، اور اگر کوئی صرف حصولِ غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی، اور نہ اس کا کوئی ثواب ملیگا، اس کی طرف خود قرآنِ پاک میں اشارہ موجود ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرما دی ہے، اس بنا پر درحقیقت وہ مالِ غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظامِ جماعت کا حق ہے، یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے، یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا

اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر "رکاز" یعنی دفینہ میں، جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آجائے خمس (یعنی پانچوان حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے،

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس مین سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عُشر یعنی دسوان حصہ مقرر کیا تھا، شریعتِ محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ، پیداوار کی مختلف قسمون پر مختلف شرحِ زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہین، تاکہ اُن سے حسب منشار خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جاسکے، اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیون اور ترکاریون پر جو ایک ڈورروز سے زیادہ نہین رہ سکتین، کوئی زکوٰۃ مقرر نہین فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس مین نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہین مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، سواری، قیمتی پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہین رکھی گئی، کچھ دنون تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چیزین چار ہین، زمین، جانور، سونا چاندی یا اُن کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چارون چیزون پر زکوٰۃ مقرر ہوئی،

زمین کی دو قسمین کی گئین، ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے مین کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہین ہوتا، بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عُشر ($\frac{1}{10}$) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاص محنت اور مزدوری سے ہو، مثلاً کوئین سے پانی نکال کر لانا، یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس مین قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسوان حصہ ($\frac{1}{20}$) مقرر ہوا، نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشوونما، اور افزایش مین انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اور جس کی افزایش

کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور جس مین ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسوان (۱/۴۰) حصہ مقرر ہوا[1]، (جانورون کا ذکر آگے آتا ہے)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ مین شرح زکوٰۃ کی کمی وبیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اُسکا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکون کو یہ چیز براہِ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہین، لیکن سونے چاندی کے مالکون اور تاجرون کی جو دولت ہے، وہ براہِ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام مین نہین آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید وفروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہین، وہ کاشتکارون کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہین، جس سے ان کی دوسری ضرورتین پوری ہوتی ہین، پھر وہ اس پیداوار کو لیکر گاؤن گاؤن، شہر شہر اور ملک بملک پھرتے ہین، اور اسکی بھی اجرت ادا کرتے ہین، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے مین صرف ہوتی ہے، اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول مین صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی صدیون کے فطری انقلابات کے بعد کہین پیدا ہوتی ہے، اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل مین انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گران تر ہے،

ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینون کے مالک عموماً دیہاتون مین رہتے اور شہرون سے دور ہوتے ہین، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکون سے بھی محروم رہتے ہین، اس لئے نسبتۃً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات، اور مستحقین کی امداد مین اس "انفاق" یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہین، جن کو عموماً نقد صورت مین دولت کے مالک، اور تاجر پورا کیا کرتے ہین، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ اُن کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہلِ زمین سے مختلف رکھی جائے،

زکوٰۃ کی شرحِ مقدار کی تعیین مین اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس مین چونکہ

---

[1] یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد مین بیان کیا ہے،

امامت وحکومت کے تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہین، اس لئے وہ کل کا خمس یعنی $\frac{1}{5}$ مقرر ہوا، اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ مین مذکور ہین، صرف آٹھ ہین، اس بناپر آٹھ مصارف کی شرح مقدار $\frac{1}{5}$ کا $\frac{1}{8}$ حصہ (یعنی $\frac{1}{40}$) مقرر ہوا، یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ مین ان آٹھ مصرفون کے لئے مجموعی رقم چالیسوان حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے، ان دو سو درمون کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائیگا، یہ کل زکوٰۃ کی شرحین $\frac{1}{5}$ و $\frac{1}{10}$ و $\frac{1}{20}$ و $\frac{1}{40}$ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہین، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے،

جانورون پرزکوٰۃ توراۃ مین ہر قسم کے جانورون مین دسوان حصہ زکوٰۃ کا تھا[1] لیکن چونکہ ہر قسم کے جانورون مین نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدتِ افزائش (زمانۂ حمل) یکسان نہین ہوتی، نیز جانورون مین دسوین بیسوین کا حصۂ مشاع ہر تعداد پر چسپان نہین ہوسکتا، اس لئے ان مین دسوین بیسوین کے بجاے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعتِ محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدایش اور افزایش کی مدت، کیفیت اور کمیت) کی بناپر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانورون کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا، مثلاً خچر، گھوڑے[2] (یا ہندوستان مین ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہین، دوسرے جانورون کی مالیت اور قوت وکیفیت افزایش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرحنامہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمتِ ربانی سے فیصلہ فرماکر طے کیا، اور زبانی نہین، بلکہ فرامین کی صورت مین لکھواکر عمال کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفاے راشدین نے اسی کی نقلین حدودِ حکومت مین بھجوائین، اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے،

نام جانور	تعداد	شرحِ زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں،

[1] احبار ۲۷-۳۲ [2] حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑون مین زکوٰۃ ہے سواری اور جہاد کے گھوڑون مین نہین

نام جانور	تعداد	شرحِ زکوٰۃ
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری،
"	۱۰ " ۱۴ "	دو بکری،
"	۱۵ " ۱۹ "	تین بکریان،
"	۲۰ " ۲۴ "	چار بکریان،
"	۲۵ " ۳۵ "	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
"	۳۶ " ۴۵ "	اونٹ کا دوسالہ بچہ،
"	۴۶ " ۶۰ "	تین سال کا اونٹ کا بچہ
"	۶۱ " ۷۵ "	چار سال کا اونٹ،
"	۷۶ " ۹۰ "	دو سال کے دو بچے،
"	۹۱ " ۱۲۰ "	تین سال کے دو بچے،
"	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ،
"	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ،
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہین،
"	۴۰ " ۱۲۰ "	ایک بکری،
"	۱۲۱ " ۲۰۰ "	دو بکریان،
"	۲۰۱ " ۳۰۰ "	تین بکریان،
"	پھر ہر سَو پر	ایک ایک بکری،
گائے، بیل، بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہین،

شرح زکوٰۃ	تعداد	نام جانور
ایک، دو سالہ بچھڑا،	۳۰	گائے، بیل، بھینس،
تین سال کا ایک،	۴۰	〃
دو سال کے دو بچھڑے،	۶۰	〃
ایک تین سال اور ایک دو سال کا،	۷۰	〃
تین سال کے دو،	۸۰	〃
〃 تین	۹۰	〃
دو سال کے دو اور تین سال کا ایک،	۱۰۰	〃
ایک دو سالہ،	پھر ہر دس مین	〃

نصابِ مال کی تعیین شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ مین شرائعِ سابقہ مین ایک اور کمی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کردی، جن دوسری شریعتون مین قانونی خیرات کی تعیین ہے اُن مین امیر و غریب اور کم اور زیادہ دولت والون کی تفریق نہین کی گئی تھی، مثلاً اگر دس بیس روپے والون، یا دس پانچ گائے اور بکری والون سے یہ زکوٰۃ وصول کیجاتی، تو ان پر ظلم ہوتا، توراۃ مین غلّہ اور مویشی پر جو عُشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے، اس مین اس کا لحاظ نہین کیا گیا ہے، بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ مین تو یہان تک کہہ دیا گیا ہے کہ

"خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے" (خروج ۳۰-۱۵)

لیکن شریعتِ محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا، اور غریبون، ناردارون، مقروضون، اور اُن غلامون کو جو سرمایہ نہین رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہین، اس سے بالکل مستثنیٰ کردیا، نیز دولت

کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مثقال رکھا لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال[1] سونے کا مالک ہو، اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درم چاندی کے سکے ہیں، یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے[2]، وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے،

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
غلہ اور پھل	پانچ وسق[3] سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
اونٹ	پانچ عدد " " "
گائے بیل بھینس،	۳۰ عدد " " "
بھیڑ بکری،	۴۰ عدد " " "
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں
چاندی	۲۰۰ درم سے کم پر زکوٰۃ نہیں،

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکسان زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہو گئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہو گئے،

ان مذکورۂ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں، پانچ وسق غلہ، دو سو درم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درم برابر ہیں،

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا سات تولہ کے، اور دو سو درم چاندی ۵۲ روپیہ کے برابر ہے،
[2] سنن ابی داؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الزکوٰۃ وحد الغنی جلد اول ص۱۶۴، اصح المطابع لکھنؤ،
[3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو،

اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ مین چالیس درہم، یا ۴ مثقال تھی یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دوسو درہم یا ۲۰ مثقال ہوگی،

زکوٰۃ کے مصارف اور ان مین اصلاحات

حضرت موسیٰؑ کی شریعت مین تین قسم کی زکوٰۃ تھی ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی، یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر ومرمت اور قربانی کے طلائی ونقرئی ظروف وسامان کے بنانے مین خرچ کیجاتی تھی (خروج ۳۰-۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جابجا کونون اور گوشون مین کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائین، وہ غریبون اور مسافرون کا حصہ تھا، (احبار ۱۹-۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانورون کا دسوان حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل وعیال کے بیت المقدس جاکر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے، اور لاویون مین جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمتگزار ہین، نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے مین وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزین بیت المقدس کے خزانہ مین جمع کردیجاتی تھین کہ ان سے مسافرون یتیمون، اور بیواؤن کو کھانا کھلایا جائے، (استثنا ۱۴-۲۲ سے ۲۹ تک)

شریعتِ محمدیہ نے مذہب کی حقیقت مین سب سے بڑی جو اصلاح کی،

۱- وہ عبادت مین خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطون کا حذف کرنا تھا، یہان ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بنا پر مفت خور کاہنون اور عبادت گاہون کے خادمون کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا کلیۃً اڑگیا،

۲- عبادت مین سادگی پیدا کرکے ظاہری رسمون اور نمایشون سے اس کو پاک کردیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانون، قربانی کے برتنون، اور محرابون کے طلائی شمعدانون کی ضرورت ہی نہین رہی،

لہ ہدایہ جلد اول، باب الزکوٰۃ فی التجارۃ،

۳۔ حج اُن ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زاد راہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی، اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہو گئی،

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے مین صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی، کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات مین خرچ ہو گئی تو اس مین ایثار کیا ہوا،

۵۔ اس طرح وہ تمام سامان اور رقمین جوان مردون سے بچین، غریبون مسکینون، اور مسافرون وغیرہ کو دے دی گئین،

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعتِ محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ مین بعض اور اصلاحین بھی کی ہین، مثلاً

۶۔ شریعتِ سابقہ مین ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہین کیجاتی تھی، بلکہ ذخیرہ مین جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غربا مین تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتین صرف کھانے تک محدود نہین ہین، اس لئے شریعتِ محمدیہ نے اس رسم مین یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دیجائے تاکہ وہ جس طرح چاہین اپنی ضروریات مین صرف کرین،

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعتِ محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کرکے اس کو بھی تمامتر مستحقین کے ہاتھون مین دیدیا،

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا، اور وہین سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزون ہو سکتا ہو، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم مین منتشر پیرون کے لئے یہ بالکل ناکافی تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اوسی مقام کے مستحقین مین صرف کیجائے،

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤن کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے،

جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے، اور جب نہ ملتی تو طعن و طنز کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگون کا منھ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کردی، اور بتادیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہین، اور اس رقم سے کس کس کو مدد دیجا سکتی ہے، چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتوین رکوع مین اسکا مفصل ذکر ہے،

۱۰۔ اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کیجاتی، اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتادیئے جاتے، تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھون مین کھلونا بنجاتا، اور سلطنت کی دوسری آمدنیون کی طرح یہ بھی انکے عیش و عشرت کے پر تکلف سامانون کے نذر ہوجاتا، اس لئے تاکید کردیگئی، کہ جو غیر مستحق اس کو لیگا، اس کیلئے یہ حرام ہے، اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دیگا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانون مین زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف مین خرچ ہوتی ہے،

۱۱۔ اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیرون پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰ کی شریعت مین زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنولادی) کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیون کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا، اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار دی،

۱۲۔ قرآن مجید مین زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے،

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ	زکوٰۃ کا مال تو غریبون، مسکینون، اور زکوٰۃ کے
وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي	صیغہ مین کام کرنے والون، اور ان لوگون کیلئے
الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ	ہے، جن کے دلون کو اسلام کی طرف ملانا ہے،
وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ	اور گردنون چھڑانے مین جو تاوان بھرین ان مین

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ، — اور خدا کی راہ مین، اور مسافر کے بارہ مین، یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے، اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے، (اس لئے اس کی یہ تقسیم علم و حکمت پر مبنی ہے)

(توبہ-۸)

فقرا مین ان خود دار اور مستور الحال شرفا کو ترجیح دی ہے جو دین، اور مسلمانون کے کسی کام مین مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہین کر سکتے اور حاجتمند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہین پھیلاتے، اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال مین قائم رکھتے ہین، چنانچہ فرمایا،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا — ان مفلسون کو دینا ہے جو اللہ کی راہ مین اٹک رہے ہین اور زمین مین (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہین سکتے، ناواقف ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے اُن کو بے احتیاج سمجھتے ہین، تم ان کو ان کے چہرے سے پہچانتے ہو، کہ وہ حاجتمند ہین، وہ لوگون سے لپٹکر نہین مانگتے

(بقرہ-۳۷)

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ اُن کی اہمیت، اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہئے، چنانچہ اسی سورہ مین فرمایا،

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ، — اور جس نے خدا کی محبت پر، (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندون، یتیمون، مسکینون، مسافرون، مانگنے والون، اور (غلامون یا مقروضون کی) گردن چھڑانے مین مال دیا،

(بقرہ-۲۲)

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے،

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (بقرہ-۲۶) — کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ، رشتہ دارون، یتیمون، مسکینون، اور مسافر کے لئے،

دو ضرورتمندون مین ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابتمندون اور رشتہ دارون کے دینے سے اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگون کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی، کہ اپنے لوگون کے دینے مین کچھ نہ کچھ نفسانیت کا، اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہین، اور ان کا نفع ونقصان اپنا ہی نفع ونقصان ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہین وہ تمامتر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہین، جو جتنا قریب ہے، اتنا ہی زیادہ آپکے حقوق اُس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہین، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابتمندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائین، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر اہل وعیال کا اُون کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال مین کچھ بچ رہے، تو اس مین حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابتدار ہین، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم مین اسی اصول کی رعایت کیگئی ہے،

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت دارون کو ترجیح دیجائے، تو دوسرے غریبون کا حق کون ادا کریگا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا مین ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ دارون کی خبرگیری کرے تو کل انسانون کی خبرگیری ہو جائیگی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہو جانا چاہئے، مستحقین مین باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزون پر ہے ایک تو دینے والون سے ان اشخاص کے قرب وبعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتون اور ضرورتون کی کمی وبیشی، قرابتمندون کی ترجیح کے یہ معنی نہین ہین کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو اُن لوگون پر ترجیح ہے جن کی ضرورت، اور حاجتمندی ان سے کہین زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے، کہ اگر دو ضرورتمند برابر کے حاجتمند ہون اور ان مین سے ایک آپکا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے، کہ ایسی حالت مین وہ اپنے عزیزون

اور دوستون کو ترجیح دے،

فقراء اور مساکین مین سے ان لوگون پر جو بے حیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانتے پھرتے ہین، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو فقر و فاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہین، لیکن اپنی عزت و آبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہین جانے دیتے، اور لوگون کے سامنے ہاتھ نہین پھیلاتے ہین، یہ تعلیم خود قرآنِ پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا "مسکین وہ نہین ہے جس کو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہین" صحابہؓ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے ارشاد ہوا " وہ جس کو حاجت ہے، لیکن اس کا پتہ نہین چلتا، اور وہ کسی سے مانگتا نہین ہے[1]"

اس تعلیم کے دو مقصد ہین ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والون کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیگا، اور وہ کہین نہ کہین سے پا ہی جائین گے، اس لیئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہین، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینون کی طرف ہونی چاہیئے، جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہین، کہ ان کی خبر بہتون کو نہین ہوسکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہجاتے ہین، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے، کہ بے حیا گداگرون کی عزت اس کی نگاہ مین نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال مین اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے،

شریعت نے مصارفِ زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر کس و ناکس اُس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا، چنانچہ وحیِ الٰہی نے ان کی پردہ دری، ان الفاظ مین کی،

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ	اور بعضے ان مین سے ایسے ہین جو تجھ کو (پیغمبر کو)
فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا	زکوٰۃ بانٹنے مین طعن دیتے ہین، اگر ان کو اسمین سے

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لایجد غنی ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ،

مِنْهَا اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ، وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا	ملے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش
مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ	ہو جائیں، اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی
سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ	رہتے، جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا
اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ، اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ	اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی
لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا	سے اور اس کا رسول دے رہیں گے، ہم کو تو
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ	خدا ہی چاہئے، زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں
وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً	کا، اور اس کا کام کرنے والوں کا، اور ان کا جنکا
مِّنَ اللّٰهِ ط	دل (اسلام کی طرف) پرچانا ہے، اور گردن
	چھڑانے میں، اور خدا کی راہ میں، اور مسافر میں، یہ حقے
(توبہ ۔ ۸ ۹)	خدا کیطرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں،

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا "اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں، اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں[۱]"

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارفِ ہشتگانہ، یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں، فقرا اور مساکین میں وہ تمام اہلِ حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے، لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں، کہ وہ

[۱] ابو داؤد، کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الصدقۃ و حد الغنی،

اپنی روزی کمانے کی فرصت نہین پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی معلمین، بالغ طالب العلم، جو لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ مین اسی طرح داخل ہین جسطرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک مین اصحابِ صُفّہ داخل تھے، اور وہ کم نصیب بھی داخل ہین جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہین، اور فاقہ کرتے ہین،

وَالْعَامِلِیْنَ عَلَیْهَا یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس مین سے اپنے کام کی اُجرت پا سکتے ہین، اور وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (جن کی تالیفِ قلوب کیجائے) مین وہ لوگ داخل ہین، جنکو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے، وَفِی الرِّقَابِ (گردن کے چھڑانے مین) اس سے مقصود وہ غلام ہین جن کی گردنین دوسرون کے قبضہ مین ہین اور اُن کو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہین، جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہین کرسکتے، وَالْغَارِمِیْنَ (تاوان اٹھانے والون) سے مراد وہ نیک لوگ ہین جنھون نے دوسرے لوگون اور قبیلون مین مصالحت کرانے کیلئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کیجا سکتی ہے، وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (خدا کی راہ مین) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کامون کو شامل ہے[1]، اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی لڑائی، یا سفرِ حج، یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جا سکتے ہین، اور وَابْنِ السَّبِیْلِ (مسافر مین) مین مسافرون کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافرون کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستون کی درستی، پلون اور مسافرخانون کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے[2]، یہ ہین زکوٰۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن مین اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم

---

[1] اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہین معلوم ہوتی، ابھی آیت گذر چکی لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یہان فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہین، بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَآءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو، جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا، [2] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، باب الصدقات،

رقم کو خرچ کرنے کی تاکید ہے،

مسکینون، فقیرون اور معذورون کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگون کی امداد کیجائے، نادار یتیمون، بیواؤن اور ان لوگون کی خبرگیری کیجائے جو اپنی کوشش اور جد و جہد کے باوجود روزی کا سامان نہین کر پاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریبًا ہر قوم مین اور ہر مذہب مین ضروری خیال کیا گیا ہے، اور ان مستحقین کی یہ قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہین، لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کئے ہین جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے،

غلامی کا انسداد

غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلامون کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسن سلوک کی تاکید کی، اور ان سب سے بڑھکر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلامون کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلامون کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زر فدیہ ہر ایک شخص برداشت نہین کر سکتا تھا، اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانون کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست مین نظر نہین آسکتی، پیغمبر اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانون کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی، کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے، جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائین، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قومون سے خاتمہ نہ ہو جائے،

مسافرون

گذشتہ زمانہ مین سفر کی مشکلات اور دقتون کو پیش نظر رکھ کر یہ آسانی سمجھ مین آسکتا ہے کہ مسافرون کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی، صحرا اور بیابان، جنگل اور

میدان، آبادی اور ویرانی، ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل وعیال، عزیز وقریب، دوست واحباب، مال ودولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہکر کہاں سے کہاں نکلجاتے ہیں اُنکے پاس کھانے کیلئے کھانا پینے کیلئے پانی سونے کیلئے بستر اوڑھنے کیلئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آجاتی ہے، اس لئے ضرورت تھی، کہ اُن کے آرام وآسایش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافر خانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے، اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں،

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانۂ کہن اور داستانِ پارینہ ہوگئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بینک، اور آمد ورفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں، اور سفر وحضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے، مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی راحت وآسایش کے لیے ہوا ہے اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پررونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولتمند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں، وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں، کسی کی جیب میں جب تک کسی بینک کا نوٹ اور چک نہیں اس کے لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں، کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول وعرض میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے قبضہ میں آئے، سراؤں، مسافر خانوں، کنووں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہوگیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بہ آرام وآسایش پہنچ جاتا تھا، اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے

تک اھلاً باھلٍ واوطاناً باوطانٍ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا، اور آج بھی اس نظام کی بدولت اُن اسلامی ملکون مین جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور وطریق سے واقف نہین ہین، غریب مسافرون کو وہی آرام وآسایش حاصل ہے، اور امراء اور دولتمندون کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہان گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق،

منعم بکوہ ودشت وبیابان غریب نیست — ہر جا کہ رفت خیمہ زد وبارگاہ ساخت

جماعتی کامون کے اخراجات کی صورت

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ مین نہین بندھ جاتے حقیقت مین جماعت کا وجود نہین ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہین، جماعت کے کمزورون، معذورون، اور مفلسون کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت مین اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد ورفت اور سفر کے وسائل کی ترقی وتعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والون، اور مقروضون کی مدد کرنا، جماعت کے ان کارکنون کو معاوضہ دینا، جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجا لائین، اور اس رقم کی فراہمی اور نظم ونسق کے فرائض انجام دین، زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایۂ دولت ہے،

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ "زکوٰۃ" کے اندر ہے، "زکوٰۃ" کے لفظی معنی "پاکی" اور "صفائی" کے ہین یعنی گناہ اور دوسری روحانی، قلبی اور اخلاقی برائیون سے پاک وصاف ہونا، قرآن پاک مین یہ لفظ اسی معنی مین بار بار آیا ہے، سورۂ والشمس مین ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا، (شمس-۱۰) — مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک صاف کیا، اور نامراد ہوا، وہ جس نے اسکو میلا اور گندہ کیا،

ایک اور سورہ مین ہے،

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی، (اعلیٰ-۱) — مراد پایا وہ جو پاک وصاف ہوا،

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کے اُن تین عظیم الشان خصوصیتون مین سے ایک ہے جنکا ذکر قرآنِ پاک کی تین چار آیتون مین آیا ہے،

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، (بقرہ وجمعہ-۱)

وہ نبی خدا کی آیتین پڑھ کر اُن کو سناتا ہے، اور اُن کو گناہون سے پاک وصاف کرتا ہے، اور اُن کو کتاب اور حکمت کی باتین سکھاتا ہے،

تزکیہ نفس | ان آیتون سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی مین کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتون کا اصل مقصد ہے، انسانون کی روحانی ونفسانی بیماریون کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجار اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے، اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا بڑا سبب، ماسوی اللہ کی محبت، اور مال ودولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے، زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی، غزوہ مین عدم شرکت کا جرم صادر ہوا ہے، اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے قرآنِ پاک مین ارشاد ہے،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا، (توبہ-۱۳)

ان کے مالون مین سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک وصاف بنا،

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال مین سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ مین دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے، مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، اور دوسرون کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے، شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے، اور یہی وہ دیوارین

ہین جنپر تہذیبِ نفس اور حسنِ خلق کی عمارت قائم، اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے،

قرآن مجید مین سود اور صدقہ مین جو حدِ فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے،

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ، (بقرہ-۳۸) خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے،

لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ درحقیقت سود مین نقصان اور صدقہ کے مال مین اضافہ ہوتا ہے کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے، بلکہ اُخروی ثواب وگناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت مین اضافہ کرتا ہے، لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے، جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے، اور قومی صدقہ وعطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے، اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے، اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ مین پڑ جاتا ہے، تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک اُنگلی تک نہین ہلاتی، لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لیے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے،

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہین کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے، اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہین وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہین کہ اُن کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص مین اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسرون کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل ومنافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے، لیکن صدقہ وخیرات دینے والا جو دوسرون کی دولت ناجائز طریق سے نہین لوٹتا، بلکہ خود دوسرون کو اپنے مال سے دیتا ہے، اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے، اس کو کوئی دوسرا بھی نہین لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہرون کی منڈیان اور کوٹھیان اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہین، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام

اخلاقی محاسن کا سنگِ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے، یہ ارشاد فرمایا کہ لیس الغنیٰ من کثرۃ العرض ولکن الغنیٰ غنی النفس[1]، تونگری دولت کی کثرت کا نام نہین ہے بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے، اسی حدیث کا ترجمہ سعدیؔ نے ان لفظون مین کیا ہے" توانگری بدل ست نہ بمال" دوسرے لفظون مین یون کہو، کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہین، بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہین، بلکہ صبر و قناعت کے بدولت حاصل ہوئی ہے، اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہّر، مزکّی، اور مصلحِ اخلاق ہونے مین شبہہ ہو سکتا ہے؟

سود خوار کو دوسرون کے لوٹنے سے اتنی فرصت کہان ملتی ہے، کہ وہ دوسرون کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک مین رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتون اور دقتون مین پھنسین، اور وہ اُن کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے، لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہین، وہ ہمیشہ قابلِ ہمدردی اشخاص کی ٹوہ مین لگے رہتے ہین تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اسکی مدد کر کے اس کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکین،

باہمی اعانت کی عملی تدبیر زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصّہ غریبون اور حاجتمندون کی امداد ہے، انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے، جس کے ساتھ تمام مذہبون نے ہمدردی کی ہے، اور اس کی تسلّی اور تسکین کیلئے دوسری دنیا کی توقع اور اُمید کے بڑے بڑے خوش آیند الفاظ استعمال کئے ہین، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہلِ مذاہب کی شیرین کلامی سے دور نہین ہو سکتی، محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہین جنھون نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور اس کی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبون اور مسکینون کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ "خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا، اور مسکینون ہی کے زمرہ مین میرا حشر کر" آپ کے گھر کا چبوترہ (صفّہ) غریبون اور مسکینون کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزمِ قدس

---

[1] بخاری کتاب الرقاق باب الغنی غنی النفس،

کے مقرب درباری، اور اسلام کے معرکون کے مخلص جانباز تھے، آپ کی نظر مین کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی، نہ دولت وامارت عزت ووقار کے مرادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیح نے فرمایا کہ "مبارک ہین وہ جو دل کے غریب ہین، کیونکہ آسمان کی بادشاہت انھین کی ہے[1]"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار وایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا،

اِن المکثرین ھم المقلون[2]، جو دولتمند ہین وہی غریب ہین،

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہین وہی دولت مند ہونگے،

پھر انھین خوشخبری دی کہ غریب (جنکو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہین دینا ہے) دولت والون سے ۴۰ سال پہلے جنت مین داخل ہونگے[3]،

اسلام نے ان روحانی تسلیون اور بشارتون کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی تکلیفون اور مصیبتون کو کم کرنے کی عملی تدبیرین ہین، جنکا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب وتشویق تک محدود نہین رکھا، بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیرین اختیار کین، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے، یہ اخلاقی خیرات ہے، جس کا نام قرآن کی اصطلاح مین "انفاق" ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہین کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اسکا مذہبی فرض ہے، اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبون اور محتاجون کی امداد واعانت کے لئے مخصوص کیا، اور رسول اللہ صلعم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا، چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا، تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے،

[1] متی ۵، ۳ [2] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون ہم المقلون [3] جامع ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء ان فقراء المہاجرین یدخلون الجنۃ قبل اغنیاءہم

پھراس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

توخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم[1] — وہ ان کے دولتمندون سے لیکران کے غریبون کو لوٹا دیا جائے،

صحابہؓ نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونون قسمون کی خیراتون پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جاکر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور بھائیون کی اخلاقی اعانت مین خرچ کرین، اوراس معاملہ مین خود آپ نے یہان تک اس طبقہ کی دلجوئی کی کہ فرمایا" اگرکسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے" اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو، خدا نے تعلیم دی،

فَاَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ، وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ، (ضحیٰ-۱) — تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک،

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو، کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اسکی توفیق عنایت کی، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائیگا، فرمایا،

لَا تُبْطِلُوا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (بقرہ-۳۶) — تم اپنی خیرات کو احسان دھرکر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو،

اس لطف، اس مدارات، اوراس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی، اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے

[1] صحیح بخاری، جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ،

کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا، یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا، تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام، اور اس پابندی کیساتھ عمل نہ ہو سکتا، اور آج بھی مسلمانون کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے، اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانون مین اگر امیر کم ہین تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہین، جیسے دوسری قومون مین نظر آتے ہین، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانون کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت مین ہے، اور اسکی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے،

دولتمندی کی بیماریون کا علاج

دولتمندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب مین ایک معرکۃ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہین جنھین نہ تو دولتمندی کی کوئی تحقیر کیگئی، اور نہ مفلسی وغربت کو سراہا گیا ہے، بلکہ گویا اس بحث کو نامنفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت، دو ایسے مذہب ہین جنھین دولت کی پوری تحقیر کیگئی ہے، عیسائیت کی نظر مین دولتمندی اور تمول، نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اُس وقت تک نجات نہین پا سکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ مین لٹا نہ دے، انجیل مین ہے کہ ایک نیکوکار دولتمند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب مین فرمایا،

"اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال، اور محتاجون کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملیگا، تب آ کے میرے پیچھے ہو لے"

وہ دولتمند یہ تعلیم سُن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل مین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا،

"مین تم سے سچ کہتا ہون کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت مین داخل ہونا مشکل ہے، بلکہ مین تم سے کہتا ہون کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے، کہ دولتمند خدا کی بادشاہت مین داخل ہو" (متی ۱۹-۲۱-۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگون کو ترکِ دنیا کی تلقین کی ہے، اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے، اور ایسے لوگون کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہون تو بھیک کا پیالہ لیکر لوگون کے دروازون پر کھڑے ہوجائین، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، ان دونون طریقون کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اُس برائی کو دوسرون کی طرف منتقل کر دینا، ان کی خیر خواہی نہ ہوئی دشمنی ہوئی، اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسرون کو دیکر خود اسی حال مین پہنچانا کہان کی دانشمندی اور اصلاح ہے، اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکسان مفید نہین ہے، نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولتمندی دنیا مین ہزارون سیہ کاریون کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزارون جرائم کا باعث ہے، اور ان دونون خرابیون سے انسانون کا بچانا ایک نبوتِ عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت، اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونون صفتون سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولتمند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ مین خدا کی ایک نعمت ہو، لعنت نہین، ہنر ہے، عیب نہین، خیر ہے، شر نہین، چنانچہ قرآنِ پاک مین متعدد موقعون پر دولت کو "خیر" اور "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے، اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے،

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ مین دے دین، آپنے فرمایا کہ "تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے، کہ وہ لوگون کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرین[1]" آپ کے حلقہ بگوشون مین دولتمند بھی تھے، اور غریب بھی، اور دونون آپکے دربار مین برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبون نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ ہمارے دولتمند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہین، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہین وہ وہ بھی کرتے ہین اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے

[1] بخاری کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس،

ہین، جو ہم نہین کر پاتے، آپ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولتمند صحابیون نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے، غریبون نے پھر جا کر عرض کی تو آپ نے فرمایا "یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے[1]"

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا مین ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آرہا تھا، اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا، ایک دفعہ آپ نے تقریر مین فرمایا کہ "لوگو! مجھے تمھاری نسبت جو ڈر ہے، وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے" صحابہ نے پوچھا "یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے" فرمایا "دنیا کا باغ و بہار" (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا "یا رسول اللہ کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟" سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہو سکتی ہے؟ آپ نے سوال سنکر ذرا تامل کیا، پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پوچھے، پھر فرمایا "بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہے، جب بعض جانور حرص و طمع مین آکر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہین تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اسکا پیٹ بھر جاتا ہے، تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے، اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینکدیتا ہے، اور پھر چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے، تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کیلئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اسکو صحیح طریقہ سے حاصل نہین کرتا، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے، اور سیر نہین ہوتا[2]"

اس تقریر مین آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہین ہے، بلکہ اس کا درست و نادرست طریقۂ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے، اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کیجائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کیجائے تو وہ نیکیون اور بھلائیون کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اور اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہین، تو وہ بری اور شر انگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، و کتاب الزہد والرقاق باب ما یحذر من زہرۃ الدنیا

دونون کے لئے یکسان ہین، ایک سخی وفیاض ومتواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر وشاکر غریب اسلام کی نظر مین فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہین، اسی طرح ایک متکبر بخیل امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہین، اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولتمندون کے اخلاق کی اصلاح کیجائے اور دوسری طرف غریبون اور فقیرون کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق و عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام مین زکوٰۃ اسی عظیم الشان دوطرفہ اصلاح کا نام ہے،

اس سلسلہ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلے حصولِ دولت کے ناجائز طریقون، دھوکا فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہین کی، اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبون کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ "سود" کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے، اسی کی ملک قرار دی، چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے، اور سب بندے خدا کے بندے ہین جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے" (طیالسی صفحہ ۲۰۴) متروکہ جائداد کا مالک کسی ایک کو نہین، بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزون کو اس کا حصہ دار بنا دیا، ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہین، بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششون کو جو انسانی محنت کی ممنون نہین جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف مین دیا، اور بن لڑائی کے دشمنون سے حاصل کی ہوئی زمینون کو امراء اور دولتمندون کے بجائے خاص غریبون اور بیکسون کا حق قرار دیا، اور اسکی وجہ بھی ظاہر کر دی،

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی	بستیون والون کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو
فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی	ہاتھ لگا دے وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ دارون
وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً	اور یتیمون اور غریبون اور مسافرون کا حق ہے تاکہ وہ لٹ
بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ۔ (حشر-۱)	پھر کر تم مین سے دولتمندون ہی کے لینے دینے مین رہجائے

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولتمندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سی بڑی سزا کا متوجب قرار دیا، اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا،

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، (حشر-۱)

اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے،

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اسکی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہردلعزیزی اور نیکنامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا،

وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ، (محمد-۴)

اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو،

اس آیت پاک میں در پردہ یہ بھی واضح کر دیا، کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمہاری نہیں بلکہ اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اسکو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے، اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے، دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے،

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا،

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ، (تکاثر-۱)

پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائیگا

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہیئے، کہ وہ اپنی دولت کو کہان اور کس طرح صرف کرتے ہین، ان لوگون کو جو اپنے روپیے کی تھیلیون کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہین تنبیہ کی،

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا	برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا، اور عیب چنتا ہو، جو
وَّعَدَّدَهٗ، يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ،	مال کو سینت کر رکھتا ہو، اور اس کو گن گنکر، وہ خیال
كَلَّا، (ہمزہ-۱)	کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہیگا ہرگز نہین

فرمایا "رشک کرنا صرف دو آدمیون پر جائز ہے، ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے، اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے، اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے، اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ مین خرچ کرتا ہے[1]" جو لوگ سونے چاندی کو زمین مین گاڑ کر رکھتے ہون اور کار خیر مین خرچ نہ کرتے ہون، ان کو خطاب کیا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہین، اور
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ	اس کو خدا کی راہ مین خرچ نہین کرتے اُن کو
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ،	دردناک عذاب کی بشارت دیدو،

(توبہ-۵)

اس آیتِ پاک نے صحابہ مین دو فریق پیدا کر دیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ مین خرچ کر دینا چاہئے، کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہیئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کریگا وہ اس آیت کے تحت مین عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت مین جو حق واجب ٹھہرایا ہے، (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہین، لیکن اہلِ رازِ صحابہ اور علماے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھولدی، حضرت موسیٰؑ کی توراۃ مین مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی

[1] بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ،

خیرات کی کوئی تعلیم نہیں، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے، یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے، اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے، اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے، ایک قانونی، اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقد میں اور عُشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع، اور صاحبِ نصاب پر واجب ہے، اور اسکا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے، اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہؓ میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے، جیسے حضرت ابوذرؓ[1]، اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لاکر ڈال دیتے تھے، جیسے حضرت ابوبکرؓ[2]، اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ[3]، اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے، اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علی مرتضیٰؓ، اور بعض انصار کرام، خدا نے انکی مدح فرمائی

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَّ — اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور
يَتِيمًا وَّأَسِيرًا (دھر - ۱) — یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں،
وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ — اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ما ادی زکوٰتہ فلیس بکنز، [2] ترمذی کتاب المناقب فضائل ابی بکرؓ، [3] اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۳۱۶،

وہ خود حاجت مند ہون،

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتون کے موافق، اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے، اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے، جس سے اہلِ حاجت اور نیک کامون کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی اہلِ دل اور اہلِ استعداد کے مرتبۂ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے، اور اس کی خوبیان اور بڑائیان بھی بیان کر دی ہین، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپرون سے اڑکر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرین،

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات مین اسلام کے اس آخری مرتبۂ کمال کی تشریح ان الفاظ مین فرماتے ہین،

"واین طائفہ، جان و مال درباختہ اند وبا ہیچ کس ماسوا اللہ نہ پرداختہ اند، گفتۂ ایشان است، الفقیر مالہ مباح ودمہ ھدر یعنی درویشِ صادق آن بود کہ بخون و مال اورا دعوی نبود . . . . اگر مالش برند خوش گردد، گوید الحمد للہ کہ حجابے از پیش من برداشتند تا گفتہ اند، زکوٰۃ نعمتِ دنیا نزدیک این طائفہ محمود نباشد، از انکہ بخل ناستودہ است، وبخلی تمام باید تا دویست درم را دربند کند، ویکسال محبوس دارد، آنگاہ پنج درم ازاں بدہد،

اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہین لگایا، اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جسکا خون معاف ہو، اسکو اپنی جان و مال پر کوئی دعوی نہ ہو . . . . اگر لوگ اسکا مال اٹھا لیجائین تو خوش ہو کہ الحمد للہ اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اُٹھ گیا، یہانتک کہ ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کرکے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہین ہے، کیونکہ بخالت تعریف کے قابل نہین، اور اس کے لئے کہ سال مین دو سو درم جمع ہون،

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے،

یکے از فقہا بر سبیل آزمایش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را
پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید، گفت جواب بر
مذہب فقیہاں خواہی، یا بر مذہب فقیراں ؟
گفت بر ہر دو جواب فرما، شبلیؒ گفت، بر مذہب
فقیہاں از دویست درم بعد از حولان حول پنج درم
باید داد، و بر مذہب فقیراں در حال ہر دویست
درم باید داد و جان شکرانہ بر سر باید نہاد، فقیہ
گفت ما ایں مذہب از ائمہ دین گرفتیم شبلی گفت
ما ایں مذہب از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی
ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ، او ہر چہ داشت پیش
سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہاد و جگر گوشۂ خویشتن
بشکرانہ داد، (مکتوب ۴۴ - سہ صدی)

کسی نے حضرت شبلی سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے
پر ہوتی ہے، فرمایا فقہار کے مسلک پر جواب چاہتے
ہو یا فقرار کے، کہا دونوں کے، فرمایا فقہار کے
مذہب کے مطابق ایک سال گذرنے پر دو سو درم
میں سے پانچ درم، اور فقرار کے مسلک پر فوراً
پورے کے پورے دو سو اور اس نذرانہ کی خوشی
میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہیئے، فقیہ
نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمہ دین سے حاصل کیا ہے،
فرمایا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبر سے حاصل کیا ہے
کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے
رکھدیا، اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ صدیقہ)
کو شکرانہ میں دیا،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی، آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا، اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر میں آرام نہ فرماتے، مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولتمندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے، اور اس لئے تاکہ بے قیدی و عدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو، مقدار معیّن کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی تاکہ جماعت کے مجبور و معذور

افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے،

اشتراکیت کا علاج | دنیا مین امیر وغریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور مین، قوم کے مختلف افراد کے درمیان، دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہوجاتی ہے بعض طبقے نہایت دولتمند ہوجاتے ہین جن کے خزانون کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہین ہوتا، اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہین جنکے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا، اور سونے کیلئے ایک بالشت زمین بھی نہین ہوتی اور دولتمند طبقون کی خود غرضی خود پسندی، عیاشی، اس حد تک پہنچ جاتی ہے، کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیون کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہین ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہین، کہ یہ اتفاقی دولت، خدا کیطرف سے نہین، بلکہ ان کے علم وہنر سعی وکوشش اور دست وبازو سے حاصل ہوئی ہے، اس لئے ان سست ناکارہ افراد کا اس مین کوئی حصہ نہین، قارون کو جب زکوٰۃ وخیرات کا حکم ہوا، تو اُس نے جواب مین یہی کہا،

اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ (قصص-۸) مجھکو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے،

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونون کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے،

یونان کے آخری دور مین یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ مین یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا مین بھی آب وہوا، اقتصادی مشکلات کے ابروباد کا طوفان اور سیلاب پیدا کررہی ہے، مزدور وسرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے، اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم، اور بالشوزم، کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہین، لیکن دنیا مین مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے، یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے، جو نقشے بنا رہے ہین، وہ انسانی فطرت وطبیعت کے اس درجہ مخالف ہین، کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کرلیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کردیا کہ ذاتی وشخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و

سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھون مین جانے سے روکا جائے، سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہین دیا، نفع عام کی چیزین اشخاص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دین، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے، جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پرانا اصول جس مین کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدلدیا، اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی، انسانی فطرت کے خلاف یہ نہین کیا کہ سرمایہ کو لیکر تمام انسانون مین برابر تقسیم کردیا جائے، تاکہ دنیا مین کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ وار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیون کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کردی تاکہ وہ اُس کے ادا کرنے پر مجبور ہو، اور جماعت کا فرض قرار دیا، کہ وہ اس رقم سے قابلِ اعانت لوگون کی دستگیری کرے، یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتون سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک مین اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اُتنے رقبہ مین جتنے مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہین ہوسکتے، خلافتِ راشدہ کے عہد مین حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب مین دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام مین قرآنِ پاک کی اس آیت کے مطابق، کہ "جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہین اور خدا کی راہ مین خرچ نہین کرتے" یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے[۱]، اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ مین دیدے، اور شام کے دولتمند صحابہؓ نے اُن کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ مین دیکر بچاتے ہین[۲]، تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہوسکی، اور نہ عوام مین کوئی فتنہ پیدا کرسکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسایش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ مین کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہین رہا[۳]،

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ مین ان روحانی اور اخلاقی فائدون کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی

---

۱ مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۶۴، ۲ فتح الباری شرح بخاری جلد ۶ صفحہ ۲۱۵، ۳ طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز صفحہ ۲۵۶،

فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہین، اوپر گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہین چیزون مین واجب ہوتی ہے جن مین دو صفتین پائی جائین یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکین، کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت مین نہ چندان فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسرون کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیون اور ترکاریون پر زکوٰۃ نہین ہے، اور نمو سے یہ مقصد ہے، کہ ان مین یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزایش کی صلاحیت ہو، اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھرون مین یا غیر مزروعہ زمین اور مکان مین بھی زکوٰۃ نہین ہے، ان دونون نکتون سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیشِ نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھین، بلکہ محنت، کوشش اور جد وجہد سے اس کو ترقی دین ورنہ اصل سرمایہ مین سال بسال کمی ہوتی جائیگی، جس کو فطرۃً کوئی برداشت نہین کر سکتا، اسطرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت وزراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہین ترقی دیجائے، کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال مین ایک خاص رقم ادا کرنا پڑیگی تو وہ کوشش کریگا کہ جہان تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے، اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہین چیزون کے ساتھ مخصوص کیا جنہین نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے، صحابہؓ کرام اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار مین مصروف رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت مین ان لوگون کو جو یتیمون کے سرمایون کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت مین لگائین تاکہ اُن کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ مین سب صرف نہ ہوجائے،

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہان مال کا اکثر حصہ بیکار زمین مین مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلعم کی زبانِ وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کرکے یہ نکتہ بتا دیا تھا،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ   اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہین

وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ، (توبہ - ۵)

اور اس کو خدا کی راہ مین نہین صرف کرتے، انکو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو،

یہ" دردناک عذاب" قیامت مین تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا مین بھی ان کیلئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہین، اور اس سے دولت کی افزایش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے، اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذابِ الیم مین مبتلا کرتے ہین، اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہین، اس لئے امرار کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی مین ہے، کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کرین،

فقرار کی اصلاح اب دوسری طرف فقرار کا گروہ ہے، اس مین کوئی شک نہین کہ دنیا کے تمام شارعینِ مذاہب نے انسانون کے اس قابلِ رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اُس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے، کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے، اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتون سے اس کو تکلیف ہوگی کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا،

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس مین افراط و تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس زخم مین صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہا نہین رکھا، چنانچہ زردشتی مذہب مین سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے، اور اس کے بالمقابل بودہ مذہب مین اس زخم کو سرتاپا مادۂ فاسد بننے دیا گیا ہے۔ اور بھکشوون کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے، لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کیلئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونون عمل کئے ہین، اس نے اس غمگین اور دردمند طبقہ کے زخم مین نشتر بھی لگایا ہے، اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیان، تسلیان، بشارتین اور عملی امداد و اعانت

کی تدبیرین ہین، جو اُس کے دل کی ڈھارس، اور اس کی امیدون کا سہارا ہین، اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہین، جو اس نے اس طبقہ کو دنائت پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسرون کی دست نگری، اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کین، اس نے اہلِ حاجت کے لئے دوسرون سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہین کی، لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پڑ ڈالا ہے،

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب مین ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو، اور غریبون اور مسکینون کو دے ڈالو، نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم، اور رحم و محبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولتمندون کو سب کچھ غریبون اور مسکینون کو دیدینے کی ترغیب دے رہے ہین، اور اس سے دینے والون کے جذبۂ ایثار اور اُن کے جود و سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہین، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو، گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی، اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہین، اور بے محنت کھانے، اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہین، اس طرح اُن کے لئے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی، اور تمام رذیل و پست اخلاق کا گڈھا تیار کر رہے ہین، جہان یہ تمام نجاستین آکر جمع ہونگی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوعِ بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنسِ بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہین ہوئی، وہ انسانون کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہین، غریب و امیر اور مسکین و دولتمند دونون آپ کی نگاہ مین یکسان ہین، اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہین دیا، بلکہ دونون طبقون کو ترازو کے دونون پلڑون مین رکھکر برابر باٹ سے تولا ہے، اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات مین سے دونون کو مساوی حصہ دیا ہے،

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے، جس پر نبیون کے خاتم اور دینون کے مکمل علیہ السلام کے سوا

دنیا کے کسی اخلاقی معلم، اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ مین ترازو کے دونون پلون کو برابر رکھ سکا، اگر غریبون کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسرون کی اعانت وہمدردی کے تمام دروازے بند کردیئے جائین، تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امرار کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک، اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہوجائیگا، اور اگر غربار اور فقرار کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دیدی جائے تو انسانون کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ وبرباد ہوجائیگی، اسی لئے داعی اسلام علیہ السلام نے، انسانون کے دونون طبقون کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونون طبقون کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا، اور دونون کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریون کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی، ایک طرف تو اسلام نے امرار اور دولتمندون کے طبقہ کو خطاب کرکے کہا،

اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ، (ضحیٰ - ۱) مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے،

دوسری طرف خوددار وبے نیاز فقرا اور غریبون کے طبقہ کی مدح فرمائی،

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا، (بقرہ ۳۷) ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہین، تو انکو اُن کی نشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگون سے لپٹکر نہین مانگتے،

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے، ان کو خطاب کرکے کہا،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى، (بقرہ - ۲۵) اور زادراہ لیکر چلو کہ بہترین زادراہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے،

ایک طرف دولتمندون کو فرمایا کہ تمہارا حسنِ اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو خالی

مت لوٹاؤ، وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ "اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو" دوسری طرف فقیرون کو فرمایا کہ تمہاری خودداری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الیدُ العلیا خیر من الید السُّفلیٰ[2] "اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانون کے دونون طبقون کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونون کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا،

صدقہ و خیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والون کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لیکر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلوون سے لیکر پینے لگتے ہین، اسی لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا،

ان ھذہ الصدقات انما ھی اوساخ الناس[3] یہ صدقہ تو لوگون کا میل ہے،

اگر آج اُن فقیرون اور گداگرون کی صورتون اور سیرتون پر نظر ڈالو جو استحقاقِ شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہین تو نظر آجائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوگون کے دلون کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے،

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتین جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہین، ان مین سے کونسی چیز ہے، جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقراء، اور مہذب گداگرون کا متمائے امتیاز نہین، اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والون کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگرون کے دامنِ دل کو نجس بنا دیتا ہے، تاہم اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرۃً ایسی مجبوریان پیش آجاتی ہین جب نفسِ الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے، گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ [2] ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلۃ [3] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ۔

کرنے کی اجازت دی جائے، شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگون کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے، اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق وعادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہین ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہین، اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہین، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱- اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے، نہ اس کو ممنونِ کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع مین اس کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے دیا جائے کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی، اور دنارت ظاہر ہوتی ہے، تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے، اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے، یا ان مین بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہون، وہ اپنی نظر مین اپنی ذلت آپ محسوس کرکے، اپنی جان پر کھیل نہ جائین،

اسلام نے انہین باتون کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی، کہ دینے والون کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ	ہم تمکو خدا کے لئے کھلاتے ہین، ہم تم سے کوئی بدلہ
جَزَاءً وَلَا شُكُورًا، (دھر-۱)	اور شکریہ نہین چاہتے،

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکرگذاری بھی نہین چاہئے، پھر صدقہ دینے والون کو یہ بھی تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے طعنہ دینے، یا لینے والے کو ذلیل ورسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی، اور تمام ثواب حرفِ غلط کی طرح تمہارے نامۂ اعمال سے مٹ جائیگا، فرمایا،

اَلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	جو لوگ خدا کی راہ مین اپنا مال خرچ کرتے ہین،

ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ط

(بقرہ - ۳۶)

اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہین، نہ طعنہ دیتے ہین، ان کا اجر ان کے خدا کے پاس امانت ہے، اور نہ ان کو قیامت مین کوئی خوف ہے، اور نہ وہ غمگین ہونگے، کچھ نرمی کی بات کہکر اور چشم پوشی کرکے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمھاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمھارے ایسے کامون پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے،

اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے ایک دلنشین تشبیہ سے واضح کیا ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ،

(بقرہ - ۳۶)

مسلمانو! اپنے صدقون کو احسان جتاکر، اور طعنہ دے کر، برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقون کو برباد کرتا ہے جو محض لوگون کے دکھلانے کو دیتا ہے، اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہین لاتا، اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے، جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو، جس نے اسکو صاف اور چٹیل کردیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہین سکتی ہے، ان لوگون نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہین اٹھا سکے، خدا کافرون کو

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے

خود کسی کو نہ دین، بلکہ وہ اس کو امیرِ جماعت کے بیت المال مین جمع کرین، اور وہ امیر حسبِ ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اس طرح غریب لینے والا اگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنونِ احسان بن کر اپنی ذلّت نہ محسوس کرے، اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منّت رکھنے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقرار اور معذورون کو دربدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی، اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلّت سے بچایا جائے،

۲- اسی لئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے مین بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے، کیونکہ جب کسی کی ذلّت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہین آتی، اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ، دنیا مین گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشے کی اشاعت کا سبب بنجائیگا اور یہ اخفاء، اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے، کہ دینے والا، نمایش اور شہرت طلبی کی آلائشون سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا، اسی لئے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائین ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو"[1]

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ،

لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہین کہ جہان صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے، اور وہ یہ کہ دوسرون کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کرکے مجمع مین سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ مین ظاہر کیا،

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، (بقرہ ۳۷)

اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقرار کو دو تو یہ بہت ہی بہتر ہے،

مفسّرین نے اس آیت کی تفسیر مین صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کیساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے، کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ

اور دوسرون مین اس کی پیروی کی ترغیب وتشویق ہوتی ہے، اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادا ے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہین لیکن ہمارے نزدیک آیتِ کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبویؐ مین تھا یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملون کے سپرد کیجائے، اس لئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق مین ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیرون کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے، اسی لئے جس آیت مین اعلان کی اجازت ہے، اس مین فقراء کو براہ راست دینے کا حکم نہین، اور جہان اخفاء کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہان فقراء کو دینے کی تصریح ہے، اس لئے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہین ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ مین ہے، کہ اگر بیت المال اور نائبینِ بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونون کا حساب پاک رہے، اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس مین حساب کتاب کی ضرورت نہین، اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ بیچ مین نہین ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تاکہ دینے والا نمایش سے اور لینے والا ذلت وخواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب، اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے مین اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکرون کی ضرورت ہو، ورنہ صحابۂ کرامؓ کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کے لئے جب تک اخبارون کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیئے جائین، دینے والون کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہین ہوتی

۳- تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دارومدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچکر نہ ٹھہرے، اور اس کو دنیا کی تمام چیزین ہیچ نظر آئین، اس بناپر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ وصدقہ مین مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتذل اور ادنی درجہ کی

چیزون کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو، کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھورپن پیدا ہوگا، کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اوس کے لالچ سے نہین بچ سکتی، اور دوسری طرف دینے والے کی روح مین بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت، حرص اور کمینہ پن، اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دیدینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہین ہوتا، بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل مین صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے،

روایتون مین ہے کہ اصحابِ صفہ کو جنھون نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسبِ معاش کا موقع نہین ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجورون کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدون مین لٹکا دیتے تھے، اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بیتاب ہوجاتا تھا، تو مجبوراً ان مین سے دو چار کھجورین توڑ کر کھالیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ،

(بقرہ ۲ – ۳۷)

مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمھارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے، بہتر حصہ خیرات کرو، اور ان مین سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو، حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لوگے لیکن یہ کہ چشم پوشی کرجاؤ، اور یقین کرو کہ خدا تمھاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے، اور وہ خوبیون والا ہے، (خوبیون ہی والی چیز پسند کرتا ہے)

۴ - فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص وطمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انھین لوگون کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگدستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ

سے جانے نہین دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابۂ کرام مین سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفّہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا، کہ پریشانیٔ صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہین کرسکتی تھی، اس بنا پر اسلام نے اُن کو زکوٰة کا بہترین مستحق قرار دیا،

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	صدقہ ان فقراء کے لئے ہے جو خدا کی راہ مین
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ	گھرے ہوئے ہین، (بغرض معاش و تجارت) سفر
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	کی قدرت نہین رکھتے، جو لوگ ان سے ناواقف
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ	ہین خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے انکو
اِلْحَافًا،	مالدار سمجھتے ہین، تم صرف ان کے بشرہ سے انکو
(بقرہ - ۳۷)	پہچانتے ہو، وہ لوگون سے گڑگڑا کر کچھ نہین مانگتے

آج مسلمانون نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑون شریف آدمی در در کی ٹھوکرین کھاتے ہین، اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہین،

۵ - لیکن با این ہمہ حزم و احتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بناپر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت مین اس کی اجازت دی، اور جہانتک ممکن ہوا لوگون کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ آنحضرت صلعم نے بعضون سے اسکی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہین مانگین گے، انھون نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ مین اگر ان مین سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے نہین کہتے تھے، کہ اٹھادو،[1] ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگیگا نہین تو مین اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہون، آپکے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے مین یہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰة باب کراہیۃ المسئلۃ

ضمانت کرتا ہون، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہین مانگتے تھے،[1]

حکیم بنؓ حزام ایک صحابی تھے، انھون نے ایک دفعہ آنحضرتؐ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیرین اور خوشرنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لیگا اس کو اسمین برکت دیجائیگی، اور جو لالچ کے ساتھ لیگا، اس کو برکت نہ ملیگی، اور اس کی حالت ایسی ہوگی، جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اسکا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، حکیم نے کہا یا رسول اللہ آج سے مین پھر کسی سے کچھ نہ مانگون گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ مین خلفا ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے رہے اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے،[2]

اس کی اور متعدد مثالین ہین، اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگون کے لئے جو صاحبِ دست و بازو ہون، یعنی جنکے ہاتھ پاؤن، اور آنکھین صحیح و سالم ہون بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کردی گئی، فرمایا کہ

لا تحل المسئلة لرجل قوي، ولا لذي مرة سوي (ترمذی)	طاقت اور سکت والے اور صحیح و سالم آدمی کیلیے بھیک مانگنا حلال نہین،

صحیح بخاری مین ہے کہ آپ نے فرمایا،

والذي نفسي بيده لان ياخذ احدكم حبله فيحتطب على ظهره خير له من ان ياتي رجلا فيسأله اعطاه او منعه (كتاب الزكوة باب الاستعفاف عن المسئلة)	قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ مین میری جان ہے، کہ تم مین کسی کا رسی لیکر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے، وہ اُسے دے یا نہ دے،

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلہ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ،

آنحضرت صلعم نے اپنے زمانہ مین اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی، آپ نے فرمایا تمھارے پاس کچھ ہے؟ عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے، آپ نے انکو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلھاڑی خرید دی، اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ، اور بیچو، انھون نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے[1]،

۶- لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسب معاش نہین کر سکتے، ان کو بھی الحاح کثرت سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ نے فرمایا،

لیس المسکین الذی ترده الا کلة والاکلتان ولکن المسکین الذی لیس له غنیً ویستحیی ولا یسأل الناس الحافًا، (بخاری کتاب الزکوۃ باب قول اللہ عزوجل لا یسألون الناس الحافا)	مسکین وہ نہین ہے جس کو لقمہ دو لقمے دروازون سے واپس لوٹا دیتے ہین، مسکین وہ ہے جو کو بے نیاز نہین ہے، لیکن حیا کرتا ہے اور لوگون سے گڑگڑا کر نہین مانگتا،

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال مین انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا،

ما زال الرجل یسئل الناس حتی یاتی یوم القیامة لیس فی وجهه مضغة لحم، (بخاری کتاب الزکوۃ باب من سال الناس تکثرا)	آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہانتک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا، کہ اُس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا،

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا مین مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھودی تھی،

ان ضروری اصلاحات کیساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا، اور ان تمام برائیون اور بداخلاقیون کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانون مین پیدا ہو سکتی تھین، اور ساتھ ہی انسانی برادری کے

---

[1] ابوداؤد- کتاب الزکوٰۃ،

دونون طبقون کو ترازو کے پلڑے مین برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا، اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا پست و بلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیئے، اور اُس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلون سے اس کو ڈرایا کرتی ہے،

آنحضرت صلعم کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابۂ مین یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اور غریب صحابیون مین یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے، دولتمند اپنی زکوٰۃ آپ لیکر بیت المال کے دروازون تک خود آتے تھے، اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سوا دوسرون کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے، اور تیسری طرف آنحضرت صلعم کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال مین اتنا سرمایہ رہتا تھا، کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہین ہوتی تھی، ضرورتمندون کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا[1]، اس طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دینے مین افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا، اور سود کی لعنت کے بغیر داد و ستد کا راستہ کھلا ہوا تھا،

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۶۸۱،

روزہ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رُکن ہے، عربی مین اس کو "صوم" کہتے ہین، جس کے لفظی معنی "رُکنے اور چپ رہنے" کے ہین، بعض مفسرین کی تفسیرون کے مطابق، قرآنِ پاک مین اس کو کہین کہین "صبر" بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی "ضبطِ نفس، ثابت قدمی اور استقلال" کے ہین، ان معنون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان مین روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشون سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعون مین اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال مین عام طور سے نفسانی خواہشون اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزین ہین، یعنی کھانا[1] اور پینا[2] اور عورت[3] و مرد کے جنسی تعلقات، انھین سے ایک مدتِ متعینہ تک رُکے رہنے کا نام شرعًا روزہ ہے، لیکن دراصل ان ظاہری خواہشون کیساتھ باطنی خواہشون اور برائیون سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی، خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت مین داخل ہے،

روزہ کی ابتدائی تاریخ روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہین، انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصولِ معاشرت) مین چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقرار کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ "روزہ کی ابتدا، اصل مین اس طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ مین خود بھوکے رہتے ہونگے اور سمجھتے ہونگے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اسطرح مردون کو پہنچ جاتا ہے،" لیکن یہ قیاس اربابِ خرد کی نگاہ مین سندِ قبول حاصل نہ کرسکا[1]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۴، طبع گیارہ،

بہر حال مشرکانہ مذاہب مین روزہ کی ابتداء اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہون، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح مین اپنے پیرو ون کی وکالت کا محتاج نہین، وہ بہ آواز بلند مدّعی ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ	مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا، جس طرح
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ	تم سے پہلی قومون پر فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار
تَتَّقُونَ ، (بقرہ ۲۳)	بنو،
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ	ماہ رمضان وہ مہینہ ہے، جس مین قرآن اتارا گیا
هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى	جو انسانون کے لئے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلین
وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ	اور حق و باطل مین فارق بنکر آیا، تو جو اس رمضان
فَلْيَصُمْهُ ، وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ	کو پائے وہ اس مہینہ بھر روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو، یا
فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ، يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ	سفر پر ہو، وہ دوسرے دنون مین رکھ لے، خدا آسانی
الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا	چاہتا ہے، سختی نہین، تاکہ تم روزون کی تعداد پوری
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ	کرسکو، اور (یہ روزہ اس لئے فرض ہوا) تاکہ تم خدا
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ،	کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو، اور
(بقرہ ۲۳)	تاکہ تم شکر بجالاؤ،

ان آیاتِ پاک مین نہ صرف روزہ کے چند احکام، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی اہمیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہین، ذیل کے صفحات مین بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہین،

روزہ کی مذہبی تاریخ قرآنِ پاک نے ان آیتون مین تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کیساتھ مخصوص نہین، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک جزء رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر اُمّی جو بقول مخالفین عالم کی

تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب مین روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے، تو اس کے علم کے مافوق ذرائع مین کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق مین یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہین، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے:۔

"روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا، قومیت و تہذیب، اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہین، لیکن بمشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہین جس کے مذہبی نظام مین روزہ مطلقًا تسلیم نہ کیا گیا ہو"

آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے"

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہین، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنون پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال مین چوبیس روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ مین ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہین، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہین، یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہین، ہندوستان کے تمام مذاہب مین جینی دھرم مین روزہ کے سخت شرائط ہین، چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہان ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن مین ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہین، قدیم مصریون کے ہان بھی روزہ دیگر مذہبی تہوارون کے شمول مین نظر آتا ہے، یونان مین صرف عورتین تھسموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی تھین، پارسی مذہب مین گو عام پیرودن پر روزہ فرض نہین، لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم اُن کے ہان موجود تھا، خصوصًا مذہبی پیشواؤن کے لئے تو پنجسالہ روزہ ضروری تھا،

یہودیون مین بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گذارے

[1] ان تمام حوالون کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳ و ۱۹۴ طبع یازدہم ۱

(خروج، ۳۴، ۲۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں، لیکن چالیسویں دن کا روزہ اُن پر فرض ہے، جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے، اور اسی لئے اس کو عاشورا، (دسواں) کہتے ہیں، یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰؑ کو توراۃ کے دس احکام عنایت ہوئے تھے، اسی لئے توراۃ میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے[۱]، اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں[۲]،

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا[۳]، حضرت یحییٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیشرو تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے، اور ان کی اُمت بھی روزہ دار تھی[۴]، یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھالئے تھے اور وہ زیادہ تر غم کے روزے تھے، اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنالیتے تھے[۵]، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا، غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰؑ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے، حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب میں فرمایا،

"کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے، روزہ رکھ سکتے ہیں جب تک دولہا ان کے پاس ہے روزہ نہیں رکھ سکتے، پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے" (مرقس ۲-۱۸)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰؑ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت میں موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں،

---

[۱] توراۃ، سفر الاحبار ۱۶-۲۹-۳۴ و ۲۳-۲۷ [۲] اول سموایل ۷-۶ و یرمیا ۳۶-۶ [۳] متی ۴-۲ [۴] مرقس ۲-۱۸ [۵] قضاۃ ۲۰-۲۶، سموایل اول ۷-۶ و ۳۱-۱۳ الوقا ۶-۱۷ وغیرہ،

انھین فقرون سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزون کو نہین بلکہ غم کے بیتدعانہ روزون کو منع فرمایا، انھون نے خود اپنے پیرون کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریون کو فرماتے ہین،

"پھر جب تم روزہ رکھو ریاکارون کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منھ بگاڑتے ہین کہ لوگون کے نزدیک روزہ دار ٹھہرین، مین تم سے سچ کہتا ہون کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر مین تیل لگاؤ، اور منھ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہین بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی مین دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے" (متی ۶-۱۶-۱۸)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہین کہ ہم پلید روحون کو کس طرح نکال سکتے ہین، وہ اس کے جواب مین فرماتے ہین :-

"یہ جنس سوائے دعا، اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہین نکل سکتی" (متی ۱۷-۲۱)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنون مین عاشورا (یعنی دسوین محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے، کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا، مدینہ مین یہود اپنا عاشورا الگ مناتے تھے[1]، یعنی وہی اپنے ساتوین مہینہ کی دسوین تاریخ کو روزہ رکھتے تھے،

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ ۲۳-۲۳)	مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلون پر لکھا گیا،

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے،

روزہ کی حقیقت انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیون اور ناکامیون کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کیجائے،

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۴۴ ۔ [2] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول صفحہ ۲۶۸،

تو آخری نتیجہ یہ نکلیگا کہ وہ دنیا مین مختلف ضرورتون کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے، اسکے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہین، اخلاق جسکا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے، اگر تحقیق کیجاے، تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرضِ نفسانی پر مبنی نظر آئیگی، اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیان اور آلودگیان صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہین، ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جاے تو وہ انسان نہین فرشتہ ہے،

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتون اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل مین آرزوؤن کا ایک ڈھیر ہے، تمناؤن کی ایک بھیڑ ہے، اور خود ساختہ ضرورتون کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑون، عالیشان عمارتون، لذیذ غذاؤن اور تیز رفتار سواریون کے بغیر ہم جی نہین سکتے؟ فرزند و عیال، زر و مال، اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہون تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا؟ پادشاہون نے فقیرون کی زندگی بسر کی ہے، اور زندہ رہے ہین، بروایتِ عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پرمسرت روحانی زندگی بسر کی،

خود ساختہ ضرورتون کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتون کا وسیع دائرہ ایک دو نقطون مین محدود ہو کر رہ جاے، اور وہ مایۂ قُوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے، جس کے بغیر انسان زندہ نہین رہ سکتا، روح اور جان کا جسم مین باقی رہنا صرف سدِ رمق پر موقوف ہے، اور سدِ رمق صرف کھانے کے چند لقمون اور پانی کے چند گھونٹون پر موقوف ہے، اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتون کا مولد و منشا انہین چند لقمون اور چند گھونٹون مین افراط، وسعت، تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے، اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالمِ ناسوت اور عالمِ ملکوت کے دو باشندون مین اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جاے تو صرف یہی ایک چیز تمام فروق و امتیازات کو محیط ہو گی، انسان کے تمام جرائم اور گناہون کی فہرست اگر تیار کیجاے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائین، تو انہین دو چیزون

کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی،

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب مین مادیات کی کثافتون سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل وشرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتون کا دائرہ کم کردے اور آخر یہ کہ قوت وغذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے، کہ انسانون کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہین، اگر یہ طلب وضرورت فنا ہوجائے تو ہم کو دفعۃً عالم ناسوت مین عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے، اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کردی ہے، اس مدت کے اندر انسانون کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے مجتنب ہوکر تھوڑی دیر کے لئے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات مین داخل ہوجانا چاہئے، اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت وعبادت ہے، اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے،

قرآن مجید نے ان تمام حقائق ورموز کو صرف ایک لفظ "تقویٰ" سے بے نقاب کردیا ہے، اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب مین مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت مین شریک کرلیا ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى	مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتون
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ، (بقرہ-۲۳)	پر لکھا گیا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو،

روزہ کی غرض وغایت "تقویٰ" ہے، یعنی اپنی خواہشون کو قابو مین رکھنا، اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچالینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا، لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتون کو بھی واضح کرتا ہے،

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ، (بقرہ - ۲۳)

تاکہ خدانے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو،

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضانِ مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑیگا،

رمضان کی ماہیت یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالمِ روحانی مین بھی اسی قسم کا ایک اور نظامِ قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے، اسی یقین کیساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے، کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح مین کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے، دنیا مین کب مبعوث ہوتا ہے، معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات مین ہوتا ہے، اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے، انکار و مزاحمت پر وہ کیون کر ہجرۃ الی اللہ کرتا ہے، اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہین انہین سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور مین آتی ہے، قرآن مجید مین تیرہ مقام پر "سنۃ اللہ" کا لفظ آیا ہے، لیکن ان مین زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے،

فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچکر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخین بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائصِ نبوت کا اصولِ قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہین،

پیغمبرانہ تاریخ کے انہین اصول و قوانین مین سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچکر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لئے عالمِ انسانی سے الگ ہو کر، ملکوتی خصائص مین جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ مین وحیِ الٰہی کا سرچشمہ موجین مارنے لگتا ہے، کوہِ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰ) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا

اور پیاسا رہتا ہے، کو وہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ[۱]) اس سے پہلے کہ اس کے منہ مین انجیل کی زبان

گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا[۲]، اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (آنحضرت صلعم)

نزولِ قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حرا نام مکہ کے ایک غار مین، ہر قسم کی عبادتون مین مصروف رہتا

ہے، اور بالآخر اسی اثنا مین ناموسِ اکبر "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ" کا مژدہ جانفزا لیکر نمودار ہوتا ہے[۳]

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (بقرہ ۲۳) رمضان کا وہ مہینہ جس مین قرآن اترا،

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ، (دخان-۱) ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات مین اتارا،

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہین؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، (القدر-۱) ہم نے قرآن کو شبِ قدر مین اتارا،

ان آیتون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس مین قرآن سب سے پہلی بار دنیا مین نازل ہوا، اور پیغمبرِ امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانون کی دستگیری کے لئے دستورنامہ[۴] الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحیِ الٰہی کا مہبط ان دنون ایک غار کے کونے مین یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا سر بہ زانو تھا، اس بنا پر اس ماہِ مقدس مین بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت[۵]

---

[۱] خروج ۳۴-۲۸ [۲] متی ۴-۲ [۳] صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب بدء نزول وحی مین اور سیرۃ ابن ہشام بدء البعثت مین ہے، [۴] روایات سے اگرچہ بتصریح یہ نہین معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرا مین روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن و اشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادات کے ساتھ غارِ حرا مین روزے بھی رکھتے تھے، جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے، کہ آپ ان دنون مین تحنث اور اعتکاف کرتے تھے، جس کا ایک جزو روزہ ہے، آج کل کے بعض علماے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے، کہ آپ ان دنون روزہ سے رہتے تھے، (دیکھو خضری مصری کی التشریع الاسلامی صفحہ ۲ و صفحہ ۴۳)

مین یکہ و تنہا رہنا (اعتکاف) نزولِ وحی کی رات مین (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدی کیلئے ضروری تھا کہ

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمھین پیار کریگا، (آل عمران - ۴)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام مین کیا ہے؟ اور رمضان مبارک مین روزون کی تخصیص اسلام مین کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہِ اقدس مین بقدر امکان اپنے حالات و جذبات مین تکیف ہونا چاہیے، جس مین وہ حاملِ قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات و حالات جنکو قرآن کے مبلغ کی پیروی مین ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہین، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکرگذاری اور خدا کی بڑائی ہے،

فرضیتِ صیام کا مناسب موقع ۲ھ

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا، اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی، تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرفِ عام مین فاقہ کشی کا نام ہے، اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے، اکثر یہ سعادت نصیب ہوجایا کرتی تھی، ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانون کو جن پریشانیون مین مبتلا کردیا تھا، اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقۂ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کردیا تھا، جن لوگون نے آنحضرت صلعم کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لئے تھے، اس حالت مین صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانون کی موجودہ زندگی کے لئے موزون ہوسکتا تھا، نماز و حج کی طرح اس مین کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقۂ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا، لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جنکا استعمال صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب امراضِ روحانیہ پیدا ہوجاتے ہین، یا اُن کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے، قوائے شہوانیہ اور

زخارفِ دنیا کی شیفتگی، اور لذاتِ حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، مکہ مین یہ تمام سازوسامان مفقود تھے، بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا، اس لئے وہان اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہین آئی، آنحضرت صلعم مدینہ مین تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانون کو وجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا، فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس مین روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آگیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت مین مسلمانون کے سامنے آکر ان کو اپنا فریفتہ بنائے، اس لئے درحقیقت یہ تدخل کا موسم تھا جس مین مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی، اور وہ پرہیز روزہ تھا، جو ۲ ؁ھ مین فرض ہوا[1] اس سے یہ شبہہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفون کو ہوا ہے، کہ چونکہ آغازِ اسلام مین مسلمانون کو اکثر فاقون سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصولِ اسلام کے رو سے فاقہ مستون کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے شکم سیرون کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زاد المعاد مین لکھا ہے، کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لئے روزہ وسطِ اسلام مین فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز، اور احکامِ قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے، اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزون تھا،

ایامِ روزہ کی تحدید روزہ ایک قسم کی دوا ہے، اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا، اگر پورا سال اس دوا مین صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانون کی جسمانی جد و جہد کا خاتمہ ہو جاتا، اور اُن کی شگفتگیِ مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس مین دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لئے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینون مین سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا، اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت

[1] تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ ؁ھ و زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۱۴۸ مصر، و زاد المعاد ابن قیم جلد اول ص ۱۶۰ مصر،

تھی، تاکہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کرکے اسلام کے نظامِ وحدت کا مظاہرہ کرین، اور اس کے لئے وہی زمانہ موزون تھا جس مین خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان، چنانچہ آنحضرت صلعم اس کے بعد جب تک زندہ رہے، اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ مین گذارا، اور آج تک کل امتِ محمدیہ پوری دنیا مین اسی مہینہ کو ماہِ صیام مانتی ہے، اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے، چونکہ روزہ بہرحال مشقت کی چیز ہے، اس لئے قرآنِ پاک مین ماہ رمضان کے روزون کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تاکہ نفسِ انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو، پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ-۲۳) اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا،

اس کے بعد تسلّی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہین کیا گیا، بلکہ

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ، (بقرہ-۲۳) جیسا کہ تم سے پہلی قومون پر بھی فرض کیا گیا تھا،

اب بھی مدت نہین بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا،

أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ، (بقرہ-۲۳) چند گنے ہوئے دن،

مدت کی تعیین اب بھی نہین، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانۂ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے، اور فرمایا "چند گنے ہوئے دن" اس کے بعد اسلامی روزون کی آسانیون کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے،

فَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ، (بقرہ-۲۳) تو جو بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنون کی گنتی،

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہوگیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ مین فرض ہونگے، کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا تو یہ کہنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنون مین رکھو، نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے

کہ جو دن ہونگے وہ گنے ہوئے مقررہ ہونگے، ورنہ مَعْدُوْدَاتٍ (گنے ہوئے) اور عِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (دوسرے دنون کی گنتی) اور پھر آگے چل کر وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ (تاکہ تم شمار کو پورا کرو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی،

وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ، (بقرہ-۲۳) — اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے،

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے،

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ-۲۳) — تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اسکے لئے، اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو،

ان آیتون مین دیکھئے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا، اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی،

انہی تمہیدون کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنون کی تعیین کیجاتی ہے، کہ وہ ایک مہینہ ہے، اور جس کو ہلکا کرکے دکھانے کے لئے فرمایا گیا تھا کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ، چند گنے ہوئے دن، ظاہر ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنون مین انتیس۲۹ اور تیس۳۰ دنون کے روزے چند گنتی کے دن تو ہین ہی، بہرحال

لہ عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایّام جمع قلت ہے جسکا اطلاق دس دنون سے زیادہ پر نہین ہوتا تو اسکو چاہیئے کہ ایّامُ العرب کو جو تعداد مین سینکڑون ہین، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیون مین محدود کردے، اسی طرح قرآن مین اللہ تعالیٰ نے جہان دنیا کے اور ہزارہا انقلابات کو ایّامُ اللہ کہا ہے (ابراہیم-۱) ان کو نو تک کے انقلابات عالم مین محدود کردے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینون مین طے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتین فرمایا، سِیْرُوْا فِیْھَا لَیَالِیَ وَاَیَّامًا اٰمِنِیْنَ (سبا-۲۰) اور فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَۃِ (گذرے ہوئے دن) جسکا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر، اور تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ کو زمانہ کے برسون اور صدیون پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکین، جمع قلت وکثرت کا یہ قاعدہ وہ بھی کلی نہین بلکہ عمومی ان الفاظ کے لئے ہے جن کی جمع قلت وکثرت دونون مستعمل ہین، ایام کا لفظ ان مین نہین اسکی صرف ایک ہی جمع آتی ہے، اور وہ اَیْوَامٌ ہے جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہے، سند کے لئے دیکھو رضی شرح کافیہ، جلد دوم بحث جمع تکسیر اور لسان العرب لفظ یوم،

رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا،

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ — وہ رمضان کا مہینہ جس مین قرآن اتارا گیا، اور

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى — قرآن مین لوگون کے لئے ہدایت ہے، اور ہدایت

وَالْفُرْقَانِ، (بقرہ ع -۲۳) — اور حق و باطل کی تمیز کی دلیلین ہین،

اب وہ مناسب موقع آیا جس مین یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنون کے روزے اسی رمضان مین جس کی یہ عظمت ہے تم پر فرض کیے گئے ارشاد ہوا،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، (بقرہ ع ۲۳) تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے

اب پورے ماہ رمضان کے روزون کی تعیین و تحدید اور ایامًا معدودات کی تشریح ہوگئی،

عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان[1] ترکیب نحوی مین اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہین گے صَامَ شَهْرًا اس کے یہ معنی نہ ہونگے کہ مہینہ مین چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائیگا، اور اگر یون کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی مین یون کہین گے صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیتِ پاک مین پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے، اور چونکہ لفظ "شہر" یعنی "مہینہ" کہا گیا ہے، اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزون کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جسکا عرب مین رواج تھا، اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوتے ہین، جیسی روایت ہو، وہی ماہِ صیام پر بھی صادق آئیگا، جیسا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات تمام صحابۂ کرام، خلفائے راشدین اور جمیع فرقِ اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے، اور احادیثِ صحیحہ مین اس کی پوری تصریحات مذکور ہین،

ایک نکتہ قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ مین دیا ہے،

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ و ظرف زمان ص۱۶۲ مطبع نولکشور ۱۸۶۸ء

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، (بقرہ-۲۳) تو جو اس مہینہ کو پاوے، تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے،

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ مین موجود اور حاضر رہنے کے ہین، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہین، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہین جو اس ماہ صیام مین موجود اور حاضر ہو، اس ماہ صیام مین غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتین ہین، ایک یہ کہ ماہ صیام آئے، اور شخص غیر حاضر ہو، یعنی اس دنیا مین موجود نہ ہو جس مین وہ ماہ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہ صیام کا وہان گذر نہ ہو، یہ صورت اُن قطعات ارضی مین پیش آئیگی، جہان شب و روز کا وہ نظام موجود نہین جو باقی متمدن دنیا مین ہے، مثلاً جن مقامات مین کئی مہینون کے دن اور کئی مہینون کی راتین ہوتی ہین، کہ وہان رمضان کی آمد کا سوال ہی نہین، ہان اگر وہان کے مسلمان چاہین، تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مانکر روزے رکھین اور کھولین، (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح مین ہے ثابت ہے)

اسی طرح وہ ملک جہان بیس بیس گھنٹون کی راتین ہون، اور لوگ روزہ کا تحمل نہ کرسکتے ہون وہ آیت وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ-۲۳) اور جو بمشکل روزہ رکھ سکین، ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے، پر عمل کر سکتے ہین،

لفظ اطاقۃ کے معنی مین بعض صاحبون کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ اس کے معنی صرف توانائی وسعت اور قدرت کے ہین، بمشکل قدرت اور طاقت رکھنے کے نہین ہین، مگر یہ صحیح نہین، اطاقۃ طاقۃ کا باب افعال سے مصدر ہے، اس کا ثلاثی مصدر کم استعمال مین آتا ہے، اور طاقۃ کے لغوی معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ مین یہ لکھے ہین،

والطوق الطاقۃ ای اقصی غایتہ، و	طوق کے معنی طاقت کے ہین، یعنی قوت کی انتہائی
هو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعلہ	غایت، اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی

بمشقة منه، مشقت کے ساتھ کرسکے،

حضرت ابن عباسؓ غالبًا یہی معنی قرار دیکر، حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی) اور بڈھے کو فرضیت سے مستثنیٰ سمجھتے تھے،[1]

روزہ پر اعتراض اور اُسکا جواب

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی، جو عام عبادت و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہین کہ وحشی انسانون کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہین کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے، اور ان غلط فہمیون کے لئے دیگر مذاہب مین گو لغزشگاہین موجود ہین، چنانچہ جوگیون اور جینیون مین روزہ کی غیر معمولی مدت اور اسکی سختیان اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہین، یہودیون کی اصطلاح مین روزہ کے لئے "نفس کو دکھ دینے" کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراۃ مین روزہ کے لئے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر الاحبار (۱۶-۲۹) مین ہے،

"اور یہ تمھارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتوین مہینے کی دسوین تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ تمھارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم مین ہے، اپنی جان کو دکھ دے"

توراۃ کے سفر العدد (۲۹-۷) مین ہے،

"اور اس ساتوین مہینے کی دسوین تاریخ مقدس جماعت ہوگی، اور تم اپنی جانون کو دکھ دو، اور کچھ کام نہ کرو"

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات مین بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ "صوم" ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہین جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک مین مسلمانون کو جہان روزہ کا حکم دیا ہے وہان یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہین،

[1] ابو داؤد کتاب الصوم باب من قال ہی مثبتۃ للشیخ والحبلی،

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ۔۲۳) — خدا تمھارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا،

اسلام کا عام قانون ہے،

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، (بقرہ۔۴۰) — خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا،

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ مین کی ہے،

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ، (اعراف۔۱۹) — وہ ان کو نیکیون کا حکم دیتا ہے، برائیون سے روکتا ہے، اور گندہ چیزون کو حرام کرتا ہے، اور اس طوق اور زنجیرون کو جو ان کے اوپر پڑی ہین، ان سے اتارتا ہے،

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات و احکام مین کوئی چیز بھی اس غرض سے نہین رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دُکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ مین داخل ہے، اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی اُن سختیون کو جو لوگون نے بڑھا رکھی تھین، بتدریج کم کر دیا،

روزہ مین اصلاحات اسلام نے روزہ کی سختیون کو جس حدتک کم کیا اور اس مین جو سہولتین پیدا کین وہ حسب ذیل ہین،

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے، ان مین اکثر روزہ صرف پیروون کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندؤن مین غیر برہمن کے لئے کوئی روزہ ضروری نہین، پارسیون کے یہان صرف دستور اور پیشوا کے لئے روزہ ہے، یونانیون مین صرف عورتون کے لئے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے،

اسلام مین پیشوا، غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہین، اس نے تمام پیروون کو عام حکم دیا اور اس مین کسی

چیز کی کوئی تخصیص نہین کی،

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ-۲۳) اس مہینہ مین جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے،

۲- اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب مین عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال مین روزہ کی جو تاریخین جن موسمون مین متعین ہونگی، ان مین تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم مین چھوٹے یا بڑے دنون مین واقع ہوتے ہین، تو یا تو وہ مختلف ملکون مین ہمیشہ کے لئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لئے آرام دہ ہین، اسلام کے روزون کی تاریخین قمری مہینون سے ہین، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنون کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہین، اس لئے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک مین ہر موسم مین آتا ہے، اور اس بنا پر اس کی سختی و نرمی بدلتی رہتی ہے،

۳- جہانتک دیگر مذاہب کی الہامی کتابون کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالتِ انسانی کی تخصیص و استثنا نظر سے نہین گذری، توراۃ مین تو یقیناً مذکور نہین بلکہ یہانتک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائیگا یا قتل ہو جائیگا، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہین مگر یہودیون کے پاس آکر رہا ہو[۱]، لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگون کو اس حکم سے مستثنیٰ کردیا، بچے مستثنیٰ ہین، عورتین ایام حمل و رضاعت اور دیگر مخصوص ایام مین روزہ سے مستثنیٰ ہین، بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہین، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہین مستثنیٰ ہین، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالتِ سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنون کی قضا بعد کو رکھین، اور جو دائمی طور سے معذور ہین، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دین،

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ

اگر تم مین کوئی بیمار یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنون مین روزہ رکھے، اور وہ لوگ

---

[۱] احبار ۱۶-۲۹،

فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، (بقرہ - ۲۳) جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں اُنپر ایک مسکین کا کھانا ہے

ترمذی مین ہے،

عن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ وضع عن الحامل والمرضع الصوم حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار دیا،

۴- اور مذہبون مین روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا، یا روزہ کے دنون مین غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اسمین بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات مین گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹون کی رکھی،

۵- جینیون کے یہان، ایک ایک روزہ ہفتون کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے، یہودیون کے ہان پورے چوبیس ۲۴ گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا،

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ، (بقرہ - ۲۳) پھر روزہ کو رات تک ختم کرو،

۶- یہودیون کے ہان یہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے کھا لیتے، پھر نہین کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب مین یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے کھا لیتے سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا، ابتدائے اسلام مین بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر مین شام کا کھانا نہین تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھین، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئین، وہ سو چکے تھے، اس لئے کھانا نہین کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا، ان کو غش آگیا، اس پر یہ آیت اُتری،

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، (بقرہ ۲۳) — اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے،

۷۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علٰحدہ رہتے تھے لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے، اسلئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کر دی، اور رات کو اجازت دیدی،

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ، (بقرہ ۲۳) — روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لئے حلال کیگئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم انکی، خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا، اب بیویوں سے ملو جلو اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے، (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو،

۸۔ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا،

عن ابی هريرة من اکل او شرب ناسیا فلا يفطر فانما هو رزق الله، (ترمذی) — ابوہریرہ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی

۹۔ اسی طرح اُن افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوتے، بلکہ بلاارادہ از خود سرزد ہوتے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا،

قال النبی صلعم لا يفطر من قاء ولا من احتلم، (ابوداؤد) — پیغمبر خدا نے فرمایا جس کو قے ہو گئی، یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آگئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا،

ملاسئے قے کے مسئلہ کی نوعیت حنفی میں کئی صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں ۱۲

۱۰۔ یہودیون مین اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار، اور غم کی علامت تھے، اس لئے روزہ کی حالت مین وہ زیب و زینت نہین کرتے تھے، اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے، حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:-

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکارون کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منھ بگاڑتے ہین کہ لوگون کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہون، مین تم سے سچ کہتا ہون کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا، اور منھ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہین بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی مین دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے، (متی ۶-۱۶)

اسلام مین بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے، اس لئے روزہ کی حالت مین سر مین تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملنا، اسلام مین روزہ کے منافی نہین، منھ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے، اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار، ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کرکے ریا مین گرفتار نہ ہو، اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے مین اور خدا کے اس حکم کے بجالانے مین نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ ہنسی خوشی، رضامندی اور مسرت ظاہر ہو،

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتون کے مقابلہ مین ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس مین غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود آنحضرت صلعم اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے، مہینون مین کچھ دن مقرر تھے، ہفتون مین بھی کچھ دن مقرر تھے ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزون کو صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی، بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا،

ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی و یسقینی — تم مین مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے،

(یعنی روحانی غذا)

لوگون نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے، جب مہینہ گذر گیا تو فرمایا

سرزنش کے فرمایا، کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا، تو مین اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا[1]،

روزہ کے مقاصد | اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام مین روزہ کے کیا مقاصد ہین، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہین،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم ربّانی محض حکم کے طور پر نہین ہے، بلکہ وہ سرتاپا حکمتون اور مصلحتون پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادّی فوائد اور منفعتون کے چہار گانہ ستونون پر قائم ہے، اوران مصلحتون اور منفعتون کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے، اور بتا دیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اوراس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا تین مختصر فقرون مین بیان کر دیئے ہین،

۱۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، (بقرہ ۲۳-۲۳)	۱۔ تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اسکی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو،
۲۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، (بقرہ ۲۳-۲۳)	۲۔ تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو،
۳۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، (بقرہ ۲۳-۲۳)	۳۔ تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم مین تقویٰ پیدا ہو)،

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبرون کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مین سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدّت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی، اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتون سے وہ پاک رہے، اور انھون نے اس طرح اپنی رُوح کو عالمِ بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہانتک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے، اور پیغامِ ربانی نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے، تب توراۃ کی لوحین ان کو سپرد ہوئین، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گذارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا مین ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروف

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۶۳،

عبادت رہے، اس کے بعد فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا،

حاملِ قرآن کی پیروی اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں، ہم دنون کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں، عیسائیون کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی مین یہی چاہئے تھا، مگر انھون نے پال کی پیروی مین جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام وسنن کی اتباع نہین کی اسکی بھی نہ کی، اسی طرح مسلمانون کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی مین یہ چند دن اسی طرح گذارین، چنانچہ فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ	اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگون پر (انکے رسولون
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ،	کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ مین) روزہ
(بقرہ - ۲۳)	فرض کیا گیا تھا، تم پر بھی فرض کیا گیا،

دینِ الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدیؐ کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتون نے اپنے اپنے پیغمبرون کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز مین بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلعم کی لاکھون اور کرورون امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے، اور اپنے رسول کی پیروی مین وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشون سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے،

شکریہ یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہین ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانون پر کیا، شکریہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی جو ان ایام مین انسانون کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ، اور ظلمانی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال

تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے، اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے، اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشتِ خاک کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے،

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ،	اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی
(بقرہ۔ ۲۳)	اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو،

اس ہدایت ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکرگذاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں، اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے، اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانۂ شکر ادا کرتے ہیں،

تقویٰ روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ	اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ	گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تاکہ
تَتَّقُوْنَ، (بقرہ۔ ۲۳)	تم تقویٰ حاصل کرو،

اسے "تقویٰ" دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بےتابانہ تڑپ ہوتی ہے، اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بھی قوت کی

افراط سے پیدا ہوتے ہین، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن نوجوانون کا علاج جو اپنی مالی مجبوریون کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہین رکھتے، اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہین رکھتے، روزہ بتایا ہے، اور فرمایا ہے کہ "روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لئے بہترین چیز ہے"[1]

۲- اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ روزہ کی مشروعیت مین ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس مین اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینون مین ایک مہینہ ہر مسلمان کو اسطرح بسر کرنا چاہئے کہ دن رات مین ایک وقت کھانا کھائے، اور ہوسکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ، محتاج اور غریب بھائیون کو کھلا دے، ـــــ ان تمام احکام پر نظر ڈالئے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہین، تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع مین روزہ کا بدل غریبون کو کھانا کھلانا، قرار دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبون کو کھانا کھلانا، یہ دونون باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہین، ایسے لوگ جو فطرۃً کمزور، یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہین، اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہون ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے،

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ، اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہون، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دین، (بقرہ ۲۳)

حج مین اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے،

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (بقرہ ۲۴) تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے،

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام مین ادا کرین جس کو تمتع کہتے ہین ان پر قربانی واجب ہے، جو غریبون ہی مین تقسیم کیجاتی ہے، اگر یہ نہ ہوسکے تو،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ، (بقرہ ۲۴) تو دس روزے رکھین، تین حج مین اور سات گھر آکر،

[1] صحیح بخاری باب الصوم،

حج مین جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اُسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منیٰ لیجا کر ذبح کیجائے، اگر یہ نہ ہوسکے تو،

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا ، (مائدہ-۱۳) یا چند مسکینون کا کھانا یا اسی کے برابر روزے،

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے، تو اُس پر دس مسکینون کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہوسکے،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ، (مائدہ-۱۲) تو تین دن کے روزے،

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کرلے، اور پھر اس کی طرف رغبت کرے، تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت مین نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ، (مجادلہ-۱) تو دو مہینے متواتر روزہ ،

اور یہ بھی ممکن نہ ہو،

فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ، (مجادلہ-۱) تو ساٹھ مسکینون کو کھانا کھلانا،

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت، صدقہ و خیرات، غریبون کے کھلانے، بلکہ غلامون کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے،

۳- روزہ ہی امیرون اور پیٹ بھرون کو بتاتا ہے کہ فاقہ مین کیسی اذیت، اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیون کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقمون سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو اُس کو بھوک کی، اور جو خود پیاسا نہ ہو اُس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا، بقول حافظ ابن قیم سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو

بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کا حال یہ تھا، کہ بعض صحابہ کہتے ہین کہ رمضان مین آپ کی سخاوت "باد روان" کی طرح ہوتی تھی، اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانون کے ہان اس مہینہ مین غریبون اور فقیرون کی امداد و اعانت اور اُن کو شکم سیر کیا جاتا ہے،

۴- انسان گو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودون مین پلا ہوا اور مال و دولت سے مالامال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی، اور سختیون کا خوگر بنائے جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ مین بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہین کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال مین ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش جد و جہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی "صبر" کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے،

۵- جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہین زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریون کا نشانہ بنا دیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہین، کہ اکثر حالتون مین انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے، مختلف بیماریون کا یہ قطعی علاج ہے، طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ مین ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام مین ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہین، مگر اسی کے ساتھ سال مین ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہین، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریون کو دور کر دیتا ہے، بشرطیکہ انھون نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور مین بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے،

صحیح بخاری باب بدء الوحی

۶۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتون پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام مین صرف ہوجاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کردے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت مین صرف کیا جاسکتا ہے، اگر ہمیشہ نہین تو کم از کم سال مین ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کرکے یہ سعادت حاصل کیجائے،

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تبخرۂ معدی کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکا کا تجربہ اس حقیقت پر گواہِ صادق ہے،

۸۔ روزہ بہت سے گناہون سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لئے یہ بہت سے گناہون کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہان روزہ اور خیرات کی یکسانی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہین سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہون اور غلطیون کا کفارہ بھی ہے، بلکہ توراۃ مین تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے،[1] اور اسلام مین بھی بہت سے موقعون مین یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنانچہ اگر قسم کھاکر کوئی اسکو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینون کو کھانا کھلائے، اگر اسکی سکت نہ ہو

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (مائدہ — ۱۲)	تو تین دنون کے روزے یہ تمہاری قسمون کا کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو، اور اپنی قسمون کا لحاظ رکھو،

اسی طرح حج کی حالت مین شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہوسکے اور چند مسکینون کو کھانا نہ کھلایا جاسکے تو

اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ	یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا

---

[1] احبار ۱۶۔ ۳۰ سے ۳۴ تک و ۲۳۔ ۲۷،

اَمۡرِہٖ عَفَا اللّٰہُ عَمَّا سَلَفَ (مائدہ-۱۳) پچھلے، اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا،

علی ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خونبہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو،

فَصِیَامُ شَہۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ تَوۡبَۃً مِّنَ اللّٰہِ تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لئے دو مہینے (نساء-۱۳) کے لگاتار روزے،

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے،

۹- اس حقیقت کو ایک اور روشنی مین دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایان ہو جائیگی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو، تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہین، دوسرے سخت کامون سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہین، دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہین، ہمارے اندرونی جذبات مین ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیان، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیت خاطر، یہ جذبات کا سکون، ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کامون کے انجام پر نظر، اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی بازپرس سے ڈر کے لئے بالکل موزون ہے، اور گناہون سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کامون کے لئے ہمارے جذبۂ روحانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمامتر عبادتون اور نیکیون کے لئے مخصوص کیا گیا ہے، اس مین تراویح ہے، اس مین اعتکاف رکھا گیا ہے، اس مین زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی، لیکن رمضان کے موسم مین وہ تیز ہواؤن سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی،[1]

[1] صحیح بخاری باب الوحی جلد اول صفحہ ۳،

۱۰- انہین باتون کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہین ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ ہی نہین رکھا گیا، یا یون کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ مین فرمائی ہے، کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہین ہے، کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے[1]" ایک اور حدیث مین ہے، کہ آپ نے فرمایا "روزہ برائیون سے روکنے کی ڈھال ہے، تو جو روزہ رکھے اسکو چاہئے کہ لغو اور فحش باتین نہ بکے، اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہانتک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے، تو یہی کہے کہ مین روزہ سے ہون[2]" بعض حدیثون مین ہے کہ آپ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے، جب تک اس مین سوراخ نہ کر دو[3]" صحابہ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ اس مین سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا "جھوٹ اور غیبت سے[4]" چنانچہ بعض علماء کی رائے مین جسطرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے[5]،

۱۱- تمام عبادات مین روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمایش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسرون پر اس کا راز افشا نہین ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے،

۱۲- اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵، و ترمذی باب الصوم ص ۹۴، و ابوداؤد صوم ص ۲۳۶ و ابن ماجہ صوم ص ۱۲۲،
[2] صحیح بخاری صوم جلد ۱ ص ۲۵۲، صحیح مسلم صوم، جلد ۱ ص ۳۲۷ مصر و موطا امام مالک صوم، ۹۷، نسائی ۳۵۵، [3] سنن دارمی صفحہ ۲۱۸، مجمع الفوائد بحوالہ نسائی صفحہ ۱۵۲ امیرٹھ، [4] مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط صفحہ ۱۵۲ امیرٹھ،
[5] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۸۸،

لئے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے، اس لئے،

الصوم لی وانا اجزی بہ[1]، روزہ میرے لئے ہے اور مین اسکی جزا دونگا،

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا، اور بعض علمائے کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت مین ہے،

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ، صبر کرنے والون کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی، (زمر -)

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لئے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت مین داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہونگے،

۱۳ - روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کے لئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے،

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، (بقرہ - ۵) اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہین، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار مین نہین، اسلئے اسکی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لئے اس آیت بالا کی تفسیر مین صبر کے معنی روزہ کے بھی لئے گئے ہین[2]،

۱۴ - یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ مین سے جن کے بدلہ مین اللہ تعالیٰ نے اپنے بندون سے خطا پوشی، گناہون کی معافی، اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے،

---

[1] صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم، [2] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱ ص ۱۹۹، مصر،

.... وَالصّٰٓئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ	.... اور روزہ دار مرد اور روزہ دار
وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَہُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیْنَ	عورتین، اور اپنی شرمگاہون کی حفاظت کرنے والے
اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمْ	اور حفاظت کرنے والی عورتین، اور خدا کو زیادہ
مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا،	یاد کرنے والے اور یاد کرنے والی عورتین، انکے
(احزاب - ۵)	لئے اللہ نے تیار رکھی ہے، معافی اور بڑی مزدوری

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے اسی طرح ہمارے روحانی گناہون کا بھی کفارہ ہے،

حج

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ، (آل عمران-۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن، اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے، اس کے لفظی معنیٰ "قصد اور ارادہ" کے ہیں، اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے، لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جاکر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہوکر کچھ آداب اور اعمال بجا لانے کا نام ہے،

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کرکے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا، اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی،

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم خلیل کے عہد میں ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسماعیل کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا، پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کرلی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا،

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصور احاطہ میں دو خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے، ایک اُس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ، اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا، عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی، اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی، اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا[۱]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی، یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیم نے نبوت پاکر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لئے تکلیفیں دیں، اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے جنہیں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی، اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار، قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی، اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں، اور شام و فلسطین گئی تھیں، اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں[۲]،

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رُخ کیا، اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاقؑ کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو اُن کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں، اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت مقرر کی

[۱] توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے، اور میری تصنیف ارض القرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں، [۲] میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے،

یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی، جس پر سے مصر و شام سے حجاز و یمن، اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں، سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا،

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے، ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے، اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لئے قوموں کے یہ گذرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی جبار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں علیحدہ رہکر لوگوں میں دینِ حق کو پھیلا سکتی تھی،

بیت اللہ | حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے، چنانچہ توراۃ کتاب پیدایش میں اُن کی تین قربانگاہوں یا "خدا کا گھر" بنانے کے واقعات مذکور ہیں،

"تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دیکے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دونگا، اور اُس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے "بیت ایل" (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا، اور وہاں اس نے خدا کے لئے ایک قربانگاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا" (۱۲-۷، ۸)

اس کے بعد ہے،

"اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت ایل میں اس مقام تک پہنچا ..... جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا" (۱۳-۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا،

"اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر کہ میں اُسے تجھکو دونگا، اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا

اور مرے کے بلوطون مین جو حبرون مین ہین جا رہا، اور وہان ایک قربان گاہ بنائی (۱۳۔ ۷۔ ۱۸)

اسی قسم کی قربان گاہین، اور خدا کے گھر، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحاقؑ کے حال مین ہے، کہ جہان ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی،

"اور اس نے وہان مذبح بنایا، اور خداوند کا نام لیا، اور وہان اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہان اسحاقؑ کے نوکرون نے کنوان کھودا" (پیدائش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہان مقدس رویا ہوئی، وہان،

"اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اُس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا، اور اس کے سرے پر تیل ڈالا، اور اُس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو مین نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب مین سے جو تو مجھے دیگا، دسوان حصہ (عُشر) تجھے (خدا کو) دونگا" (۲۸-۱۸-۲۲)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے،

"اور اگر تو میرے لئے پتھر کی قربانگاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو، کیونکہ اگر تو اس کے لئے اوزار لگائے گا تو اُسے ناپاک کریگا، اور تو میری قربان گاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو" (خروج ۲۰-۲۵-۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب،

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربانگاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقون کے لئے بارہ ستون بناے۔۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور سلامتی کے ذبیحے بیلون سے خداوند کے لئے ذبح کئے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے باسنون مین رکھا، اور آدھا قربانگاہ پر چھڑکا" (خروج ۲۴-۴-۶)

اوپر کے اقتباسات مین اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربانگاہ) بتایا گیا ہے، اور دوسرا

بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی نسل میں اس قسم کی قربانگاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں، کعبہ، مسجد حرام، اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے،

حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی اور اس کے شرائط

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآنِ پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے، اور یہ بحث بھی وہیں گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادتگاہ کی خدمت کے لئے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ، جانوروں پر ہاتھ رکھدیتا تھا، اور وہ جانور اس کی طرف سے قربانی کئے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادتگاہ کی خدمت کے لئے نذر کئے جاتے تھے، وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہوجاتے تھے تب اُن کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی با نذر پیش کیجاتی تھی وہ پہلے قربانگاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کیجاتی یا جلائی جاتی تھی،

ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے،

توراۃ اور قرآنِ پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی، اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی، اور اسی امتحان اور آزمایش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور اُن کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالامال کیگئی، توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے، (۲۲-۱۶-۱۷-۱۸)

"خداوند فرماتا ہے، اس لئے کہ تونے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دونگا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤنگا، اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازہ پر قابض ہوگی، اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائیگی، کیونکہ تونے میری بات مانی"

قرآن پاک مین ہے،

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ (بقرہ ۔ ۱۵)

اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتون مین اسکی آزمائش کی، پھر اس نے ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا کہ مین تجھ کو لوگون کیلئے پیشوا بنانے والا ہون،

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۔ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (بقرہ ۔ ۱۶)

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا مین چنا اور وہ آخرت مین یقیناً نیکون مین سے ہے، جب اس کے خدا نے اُس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کردے، اس نے کہا مین نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کر دیا،

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (صفّت ۔ ۳)

اے ابراہیم تونے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والون کو بدلہ دیتے ہیں،

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن مین پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہین،

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

خدایا تو محمد اور محمد کی جسمانی وروحانی نسل پر برکت نازل کر جس طرح تونے ابراہیم اور ابراہیم کی جسمانی وروحانی نسل پر برکت نازل کی،

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ رُوح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ مین تھی، یہ اپنے عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی "پیشوائی" اور آخرت کی "نیکی" نہین ملسکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشون، تمناؤن اور آرزوؤن کی قربانی تھی، اور خدا کے

حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشید حقیقت کا ظلِ مجاز تھا،

اسلام قربانی ہے| اسلام کے لفظی معنی "اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور طاعت اور بندگی کے لئے گردن جھکا دینا" ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹون کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی مین اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا،

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ،	جب ابراہیم اور اسمٰعیل اسلام لائے، (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسمٰعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا،
(صفٰت - ۳)	
وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ، وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِی الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ، اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ،	اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کریگا، لیکن وہ جو خود بیوقوف ہے، ہم نے اس کو دنیا مین مقبول کیا، اور وہ آخرت مین بھی نیکوں مین سے ہوگا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا، (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا مین نے پروردگارِ عالم کی فرمانبرداری کی، (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا،)
(بقرہ - ۱۶)	

الغرض ملتِ ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انھون نے اپنے کو خدا کے ہاتھ مین سونپ دیا، اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے، اور یہی ابراہیمی ملت ہے، اور اسی بارِ امانت کو اٹھانے کے لئے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے، کہ ان کی نسل مین اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ

ہین موجود رہین، اور بالآخر ان کی نسل ہین وہ امین پیدا ہو، جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا پر وقفِ عام کردے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ،

(بقرہ ٨-١٥)

ہمارے پروردگار ہم کو مسلمان (یا اپنا فرمانبردار) بنا، اور ہماری نسل ہین سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بتا، اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار اس ہین اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتین اُن کو پڑھ کر سنائے، اور ان کو کتاب، اور حکمت سکھائے، اور اُن کو پاک اور صاف کرے تو غالب اور حکمت والا ہے،

یہ رسول محمد رسول اللہ صلعم تھے، یہ کتاب قرآنِ پاک تھی، یہ حکمت سینۂ محمدی کا خزانۂ علمی وعملی تھا، اور یہ مناسک اسلام کے ارکانِ حج تھے،

یہ قربانی کہاں ہوئی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ ہین اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجمون نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے، اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجمون نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانون کے مقابلہ سے ١٨٩٠ء ہین اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع ہین چھپا ہے، اس ہین اس مقام کا نام "مُرِیّا" لکھا ہے، اور اس کے فارسی ترجمہ ہین جو انہی زبانون کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کیطرف سے ١٨٥٨ء ہین لندن ہین چھپا ہے، اس کا تلفظ "موریا" کیا ہے، اور

درحقیقت یہ لفظ مُروہ ہے جو مکہ مین بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

"خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خود را کہ یگانہ تست و اورا دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمین موریا برو، و اورا در آن جا بر یکے از کوہ ہا یکہ بتو نشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران، بامدادان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدہا) خود را بیاراست و دو نفر از نوکران خود را با پسر خویش "اسحاق" برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد، و بسوئے آن مکانیکہ خدا اورا فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چشمان خود را بلند کردہ آن مکان را از دور دید، آنگاہ ابراہیم بجادمان گفت شما ایں جا بمانید، تا من با پسر بدانجا رویم و عبادت (دوسرے ترجمون مین سجدہ ہے) کردہ نزد شما باز آئیم" (پیدائش ۲۲)

اس عبارت مین اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے، اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلون سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ مین اس پر مختصر بحث گذر چکی ہے، اور ہماری جماعت مین سے، جناب مولنا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصحیح فی من ہو الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے، اس لئے یہان بحث بے محل ہے، بہر حال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے لئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہان وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتون کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گذرانی جائے وہ کوئی قربانگاہ، اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لئے بھی کہ وہان حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی، اور سجدہ کیا، اور وہ قربانگاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکرون کو یہ کہا جاسکے کہ "مین وہان جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہون" یہ خصوصیتین کعبہ کے سوا کہین اور نہین پائی جاتین اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کرسکے، اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) مین موجود تھی، اور نہ ہے، اور نہ بیت المقدس یا مسیح کی

دلاونگاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے،

برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربون مین اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزارہا برس سے محفوظ چلی آتی تھی، اور گو اس مین امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا بعد کی گمراہیون کے سبب سے اس مین بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی تھی، تاہم اصل شئی باقی تھی، عرب مین بت پرست بھی تھے ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے، اور یہودی بھی تھے، مگر عربون کے قدیم اشعار سے ثابت ہے، کہ ان سب کو خانۂ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکسان اعتراف تھا، یہانتک کہ عیسائی عرب بھی اسی کی قسمین کھاتے تھے، اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ خانۂ کعبہ مین جہان مشرکون کے بتون کی صفین تھین حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسٰیؑ، اور حضرت مریمؑ کی تصویرین بھی تھین[1]،

مکہ اور کعبہ | کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتون اور برکتون کا سمت القدم ہے، وہ ازل سے اس دنیا مین خدا کا معبد، اور خداپرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبرون نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتون کی سمت اس کو قرار دیا کہ

اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ، (آل عمران - ۱۰) سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگون کے لئے بنایا گیا،

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیون مین اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمتکدہ مین توحید کا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا، کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کرکے، دنیا مین توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۴-۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ مین بھی اَلْبَيْتِ الْعَتِيْقِ، (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادون کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی، فرمایا اِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ، (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادین اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی حضرت

---

[1] اخبار مکہ للازرقی، و فتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ، و سیرۃ ابن ہشام،

ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیمؑ نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لئے قرآن پاک نے کہا،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا۔ (حج-۴) — اور ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر کی جگہ کو "ٹھکانا" بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا،

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتادی، اور اس کو اُن کی جاپناہ اور ٹھکانا بنا دیا، کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں، توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا، کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کیجائے وہ کوئی معبد یا قربانگاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ کو قربانی کرنے کے لئے لائے تھے، اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا، کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں، ضروری ہے، کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (اور میرے گھر کو عبادتگذاروں کے لئے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو جیسا کہ توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا، کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا، اور کبھی اسکا نام "بیابان" تھا، اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہیں[1]، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا،

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ۔ (ابراہیم-۶) — خداوندا میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لاکر بسایا ہے،

---

[1] اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے، از ص ۵۵ تا ص ۹۰ طبع اول،

توحقیقت مین یہ بن کھیتی کی ترائی" اور "بے آب و گیاہ میدان" اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی، اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بنگئی، اور اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے یہان حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کرتے ہوے یہ دعا مانگی،

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ، اور خداوندا یہان کے رہنے والون کو پھلون

(بقرہ ۔ ۱۵) کی روزی پہنچا،

"مکہ" قدیم زبانون کے بعض محققون کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی "گھر" کے ہین[1]، اس سے دو حقیقتین ظاہر ہوتی ہین، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اُس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گذرتے تھے، اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود مین آئی، اور یہ اس خانۂ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیلِ قاطع ہے، مکہ کا "بکہ" نام حضرت داؤدؑ کی زبور مین سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ مین اس کا حوالہ گذر چکا ہے، یہان یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان مین "بکت" کے معنی آبادی یا شہر کے ہین، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے، یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے، اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک مین آیا ہے،

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ پہلا گھر جو لوگون کی عبادت کے لئے بنایا گیا وہ

بِبَکَّۃَ، (آل عمران ۔ ۱۰) وہی ہے جو بکہ مین ہے،

کعبہ کے لغوی معنی "چوکھونٹے" کے ہین، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے، اس لئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا،

---

[1] تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۴۴، مصر،

یونانی تاریخون مین بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گذرا ہے، وہ عرب کے ذکر مین کہتا ہے،

"ثمودیون اور سبا والون کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہین[1]"

ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود مین تھا، اور سبا کا یمن مین، ظاہر ہے کہ ان دونون ملکون کے درمیان حجاز ہی ہے، اور وہان کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہون خانۂ کعبہ ہے، رومیون کی تاریخ مین بھی خانۂ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مؤرخ لکھتا ہے، کہ ۵۴۱ء مین رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسرون کا ایک جلسۂ مشاورت کیا، اس مین شام کے دو افسرون نے اٹھ کر کہا کہ وہ آیندہ لڑائی مین شریک نہین ہو سکتے کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کردیگا، اس پر سپہ سالار نے کہا،

"تمھارا یہ خطرہ صحیح نہین ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس مین عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لئے خاص کرتے ہین، اور اس زمانہ مین ہر قسم کے ہتھیارون سے وہ پرہیز کرتے ہین[1]"

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے،

ان تمام شہادتون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسمٰعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے، اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کیساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار مین حج اور ارکانِ حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے[2]، یہانتک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے[3]، عرب کے بازارون اور میلون کی روایات کے قائم رکھنے مین بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا[4]، اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشون مین یہانتک کہ

---

[1] گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰،

[2] تاریخ الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۸۳ء

[3] مولٰنا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن مین اس قسم کے اشعار جمع کردیئے ہین،

[4] کتاب الازمنہ والامکنہ امام مرزوقی طبع حیدرآباد جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰،

یمن و بحرین تک مین پہنچنے مین کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم مین عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی مین اس عربی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے،

حج ابراہیمی یادگار ہی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا، اور اُس پر لبیک کہا تھا، اور جس کی تعمیل کے لئے وہ اس دور دراز مقام مین آئے تھے، اور عین اُسوقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ مین قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سُن گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی،

أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا — یہ کہ اے ابراہیم تونے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ، ۔۔۔۔ — ایسا ہی نیکوکارون کو بدلہ دیتے ہین، ۔۔۔۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ، (صفّٰت - ۳) — اور ایک بڑی قربانی دیکر ہمنے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا،

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کیلئے مخصوص کر دینا، اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرۂ ارضی مین خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے،

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا ط وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ط وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ط قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ط وَبِئْسَ الْمَصِيرُ

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگون کا مرجع اور امن بنایا، اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ابراہیم و اسمٰعیل سے عہد لیا کہ تم دونون میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والون کے لیے پاک کرو، اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اسکو امن والا شہر بنا، اور اس کے بسنے والون کو کچھ پھلون کی روزی دے، جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا اور جس نے

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
وَإِسْمٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً
مُسْلِمَةً لَكَ ص وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ
عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ
رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا
عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ، إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ
وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا
مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ
فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ
إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ
لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ،

(البقرہ - ۱۵ و ۱۶)

انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤنگا، پھر اسکو دوزخ
کے عذاب کے حوالہ کرونگا، اور وہ کتنی بری باز گشت
ہے، اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسمٰعیل اس گھر
کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، (اور یہ دعا مانگ رہے
تھے کہ) ہمارے رب (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے
قبول فرما، بیشک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے
اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک تابعدار (مسلم)
فرقہ بنا، اور ہم کو اپنے حج کے ارکان دکھا، اور ہمپر
اپنی رحمت رجوع کر، (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ
قبول کرنے والا اور رحم والا ہے، اے ہمارے رب!
ان میں، انھیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج
جو اُن کو تیری آیتیں سنائے، اور ان کو کتاب اور
حکمت کی تعلیم دے، اور اُن کو پاک و صاف بنائے
بیشک تو غالب اور دانا ہے، اور ابراہیم کے دین سے
کون منہ پھیریگا، بجز اس کے جو اپنے آپکو نادان بنائے
حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا، اور
آخرت میں وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا، یاد کرو
جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلم)
بن جا، اُس نے کہا عالم کے پروردگار کا میں تابعدار

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ
وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا
وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ
لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ
اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ
مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا
وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ثُمَّ لْيَقْضُوْا
تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا
بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ
حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ

(حج - ۴)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ
کو ٹھکانا بنایا، کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا، اور میرے
گھر کو طواف، قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والون
کے لئے پاک کر، اور لوگون مین حج کا اعلان کردے
وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی)
دُبلی سواریون پر، ہر دور دراز راستہ سے آئین گے
تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہون پر حاضر ہون، اور ہم نے
ان کو جو چوپاے جانور روزی دیئے ہین، ان پر
ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنون مین خدا کا نام
لین، تو ان مین سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر
کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کرین، اور
اپنی منتین پوری کرین، اور اس قدیم گھر کا چکر لگائین
یہ سن چکے، اور جو کوئی، اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے
تو وہ اس کے لئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ
الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا
مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ
وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی اے میرے
پروردگار اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھکو اور میری
اولاد کو بتون کی پرستش سے بچا، میرے پروردگا
ان بتون نے بہتون کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری
پیروی کریگا، وہ مجھ سے ہوگا، اور جو میری نافرمانی

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ
ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ، رَبَّنَا
لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ
تَھْوِیْٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ، رَبَّنَآ اِنَّکَ تَعْلَمُ
مَا نُخْفِیْ وَمَا نُعْلِنُ، وَمَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰہِ
مِنْ شَیْءٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ،

(ابراھیم - ٦)

کریگا، تو تو بخشنے والا مہربان ہے، اے ہمارے پروردگار
ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی مین
تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے
پروردگار، یہ اسلئے تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کرین، تو کچھ
لوگون کے دلون کو ایسا بنا کہ وہ اُن کی طرف
مائل ہون، اور ان کو کچھ پھلون کی روزی دے
تاکہ یہ تیرے شکرگذار رہین، اے ہمارے پروردگار
تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائین اور جو ظاہر کرین، اور اللہ سے
زمین مین اور نہ آسمان مین کچھ چھپا ہے،

قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ
حَنِیْفًا، وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ، اِنَّ
اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ
مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ، فِیْہِ اٰیٰتٌۢ
بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ، وَمَنْ دَخَلَہٗ
کَانَ اٰمِنًا، وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ
مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا، وَمَنْ
کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ،

(آل عمران - ١٠)

کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی
کرو، شرک سے منہ موڑ کر، اور ابراہیم مشرکون مین
نہ تھا، بیشک وہ پہلا گھر جو لوگون کے لئے بنایا گیا
وہی ہے جو بکہ مین ہے، بابرکت، اور دنیا کیلئے
راہ نما، اس مین کچھ کھلی ہوئی نشانیان ہین ابراہیم
کے کھڑے ہونے کی جگہ، اور جو اس مین داخل ہو
وہ امن پا جائے، اور خدا کا لوگون پر اس گھر کا
قصد کرنا فرض ہے، جسکو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت
ہو، اور جو (اس قدرت کے باوجود) اس سے باز
رہے تو خدا دنیا والون سے بے نیاز ہے،

یہ وہ آیتین ہین، جنکا تعلق اس موضوع سے ہے، ان مین نہایت وضاحت کیساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکون سے ہٹا کر جنمین وہ سرگردان اور آوارہ پھر رہے تھے، اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش مین تھے، تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک گھر بنائین، یہ ٹھکانا عنایت کیا، جو ازل سے اس کام کے لئے منتخب تھا، تاکہ وہ یہان خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کرین، اور پھر اسکو توحید کا مرکز اور عبادت گذارون کا مسکن بنائین،

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا! یہان تیرے مقدس گھر کے پڑوس مین اپنی کچھ اولاد بساتا ہون، اُن کو روزی پہنچانا، اور لوگون کے دلون کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہین، اور ان کو اس لئے یہان بساتا ہون تاکہ وہ آس پاس کی بت پرست قومون کی بُت پرستی سے بچے رہین اور تیری خالص عبادت بجا لائین، ان مین جو نکوکار ہون وہ میرے ہین، اور جو بدکار اور گمراہ ہون ان کا تو مالک ہے، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوندا! میری اولاد مین ایک رسول بھیجنا، جو اُن کو نیک تعلیم دے،

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر مین حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیان ہین، اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ، اور قربانی کا مقام ہے، اس لئے لوگون کو چاہیے کہ دور دور سے یہان آئین اور اپنے دینی و دنیاوی فائدون کو حاصل کرین، اور اس قدیم خانۂ خدا کا طواف کرین، اور یہان اسمٰعیلؑ کی یادگار مین قربانی کرکے غریبون کو کھلائین، اپنی نذر پوری کرین، اور اس حالت مین وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہون، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہون، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہون، اور وہ اس حالت مین ظاہری زیبایش و آرایش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہون، اور چند روز یہان ابراہیمی یادگارون پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کرکے، ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کرین،

اوپر توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کی اولاد کا دستور تھا، کہ وہ جہان

کہین کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے، تمدّن کے اس ابتدائی عہد مین کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کرکے خدا کا گھر بنا لیتے، وہان قربانی گذرانتے، اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قسم کا گھر یہ خانۂ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالون سے گذر چکا ہے، کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لئے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنون تک سر نہین منڈاتا تھا، نذر پوری کرلینے کے بعد وہ سر پر استرہ لگاتا تھا، پھر جہان یہ مذکور ہے کہ "اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو"[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے، اور کمر مین تہ بند باندھتے تھے، توراۃ کے فارسی اقتباس مین جو اوپر نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے لئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب مین "لبّیک" کہا اور اردو مین ہے کہ "مین حاضر ہون" کہا، یہی صدا لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ اسلامی حج مین اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گذر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے، اس کو قربانگاہ کے چارون طرف پھراتے تھے، یا نثار کرتے تھے، حج مین یہ طواف کہلاتا ہے، غرض انھین سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام مین "حج" ہے،

حج کی حقیقت ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتون اور برکتون کے مورد خاص مین حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا، اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے، یعنی ان دو برگزیدہ بندون کی پیروی مین اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجا لانا جس طرح وہ ہزارون برس پہلے بجا لائے، اور خدا کی نوازشون اور بخششون سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے، جس کو حاجی ان بزرگون کے مقدس اعمال اور قدیم دستورون کے مطابق، حج مین اپنے عمل اور کیفیت سے مجسّم کرکے ظاہر کرتے ہین، تمدّن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنون بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہین، وہ خود اپنے کو حضرت

[1] خروج ۲۰-۲۶،

اسمٰعیلؑ کی طرح خدا کے حضور مین نذر کرنے جاتے ہین، اس لئے اتنے دنون تک سر کے بال نہ منڈاتے ہین، نہ ترشواتے ہین، دنیا کے عیش ونشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہین، نہ خوشبو لگاتے ہین، نہ رنگین کپڑے پہنتے ہین، نہ سر چھپاتے ہین، اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد وغبار مین اٹے ہوئے، دوڑے ہوئے خدا کے گھر مین آئے تھے، آتے ہین، اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ اُن کی زبانون پر ہوتا ہے،

لبیك اللّٰھم لبیك، لبیك لا شریك	مین حاضر ہون اے اللہ، مین حاضر ہون، مین
لك لبیك، ان الحمد والنعمۃ لك	حاضر ہون تیرا کوئی شریک نہین، سب خوبیان
والملك لك،	اور سب نعمتین تیری ہی ہین، اور سلطنت تیری
(صحیح مسلم حج)	ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہین،

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ، اور یہ توحید کی صدا، ان تمام مقامات اور حدود مین بلند کرتے پھرتے ہین، جہان جہان ان دونون بزرگون کے نقشِ قدم پڑے تھے، اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربانگاہ پر نذر کرنے چلتے ہین، اسلئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چارون طرف پھر اکر تصدق کرتے ہین، پھر جہان سے جہان تک (صفا سے مروۃ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے، کہ مروہ پر پہنچکر بیٹے کی قربانی کرینگے، وہان ہم دوڑتے ہین، اور دعا کرتے ہین، اور گناہون کی بخشایش چاہتے ہین، اور عرفات کے سب سے بڑے میدان مین جمع ہو کر، اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہون اور کوتاہیون کی معافی چاہتے ہین، خدا کے حضور مین گڑگڑاتے ہین، روتے ہین، قصور معاف کراتے ہین، اور آیندہ زندگی کے لئے، خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد وپیمان باندھتے ہین، اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے[۱]، یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد، ان بزرگون کے نقشِ قدم اور

[۱] ترمذی کتاب الحج باب ماجاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج،

ان کی دعا، کے مقامات، اور تجلیاتِ ربّانی کے مناظر، دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد، اکثر دن کو عمر مین ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع، اور لاکھون بندگانِ خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ مین، ایک ہی لباس اور شکل و صورت، ایک ہی حالت اور جذبہ مین سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان، اور جلے ہوئے پہاڑون کے دامن مین اکٹھے ہو کر، دعا و مغفرت کی پکار، گذشتہ عمر کی کوتاہیون اور بربادیون کا ماتم، اپنی بدکاریون کا اقرار، اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہان ابراہیمؑ خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاءؑ اسی حالت اور اسی صورت مین اور یہین پر کھڑے ہوئے تھے، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے، جس کی لذت تمام عمر فراموش نہین ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کرکے، اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل مین جسمانی طور سے ذبح کرتے ہین، اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی، اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہین، جو کبھی اسی میدان مین اسی موقع پر اور اسی حالت، اور اسی شکل مین دنیا کے سب سے پہلے داعیِ توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی، اور وہی جذبات اس وقت حاجیون کے دلون مین موجزن ہوتے ہین اور اُن کی زبانون سے حضرت ابراہیمؑ ہی کے الفاظ کی صورت مین ظاہر ہوتے ہین، (صحیح مسلم کتاب الحج)

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ	مین نے ہر طرف سے منھ موڑ کر اس کی طرف منھ
وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ	کیا جس نے آسمانون کو اور زمین کو پیدا کیا، موحد
(انعام - ۹)	بنکر اور مین اُن مین نہین جو خدا کا شریک بناتے ہین،
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ	میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، لَاشَرِیْکَ لَہٗ	سب اللہ کے لئے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے،
وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ،	اس کا کوئی شریک نہین، اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور

(انعام - ۲۰) میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام) کا اقرار کرتا ہوں

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم و ارکان ہیں،

حج کی اصلاحات حج کی فرضیت دوسرے عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی، اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی، اس لئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں، روزہ نے بھی یوم عاشورا سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقۂ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا،

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱- ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور اعلاے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکتے تھے، تو تمام قبائل منیٰ میں آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا، اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباء واجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا،	جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو،
(بقرہ - ۲۵)	

۲- قربانی کرتے تھے، تو اس کے خون کو خانۂ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے، کہ خدا سے تقرب

حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی، کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربانگاہ پر دیتے تھے، اور قربانی کا گوشت جلادیتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹادی گئیں، اور یہ آیت اتری،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَادِمَآءُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ، (حج - ۵)

خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے،

اور آگے چل کر یہ بھی بتادیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کیجائے، اور اس جشن ہی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے،

۳- اہل یمن کا دستور تھا، کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے، تو زادراہ لے کر نہیں چلتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے، تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،[1]

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى، (بقرہ - ۲۵)

زادراہ ساتھ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زادراہ پرہیزگاری ہے،

۴- قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کرلئے تھے، ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس غرض سے خانۂ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا، جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے،[2] ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا، اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لئے کپڑا مستعار دیتی تھیں، اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا،[3] اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا، اور یہ آیت اتری،

---

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۰۶ کتاب الحج [2] طبقات ابن سعد تذکرۂ حضرت حمزہ سید الشہداء [3] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۲۶ کتاب الحج،

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف-۳) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو،

اور ۹ھ کے موسمِ حج میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت ابوبکرؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ آیندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی[1]،

۵- قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے، لیکن وہ خود حدودِ حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہ آیت[2] اتری

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ-۲۵) کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں

۶- صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گذرتے تھے، اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنّت نہیں قرار دیا[3]، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی،

۷- جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اُس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے، اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے یکلخت ان باتوں کو بند کر دیا، اور حج کو تقدس، تورّع، نیکی، اور ذکرِ الٰہی کا سراپا مرقع بنا دیا، حکم آیا،

فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ط (بقرہ-۲۵)

پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیّت کی تو پھر حج میں عورت سے چھیڑ چھاڑ ہے، نہ فحاشی ہے، نہ لڑائی دنگا ہے، اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہو گی،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحج باب لایطوف عریان، [2] بخاری کتاب الحج جلد اوّل ص۲۲۶، [3] بخاری جلد ا صفحہ ۲۴۳،

۸۔ مناسکِ حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان مین دو گروہ ہوگئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایامِ تشریق ہی مین واپس آتے ہین وہ گناہگار ہین، دوسرا ان لوگون کو الزام لگاتا تھا، جو دیر مین واپس ہوتے تھے، چونکہ ان مین درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا، اس لئے قرآن مجید نے دونون کو جائز رکھا،

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ	جو شخص عجلت کرکے ایامِ تشریق کے دوہی دنون
وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ لِمَنِ اتَّقٰی،	مین واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہین ہے اور
	جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہین ہے بشرطیکہ
(بقرہ – ۲۵)	اس نے تقویٰ اختیار کیا،

۹۔ ایک خاموش حج ایجاد کرلیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اُس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انھون نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے[1]،

۱۰۔ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے، اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڈھے کو دیکھا، کہ اپنے دو بیٹون کے سہارے پیادہ پا جارہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب مین ڈالے، چنانچہ آپ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا[2]، اسی طرح عورتین خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھین، آپ نے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ "خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا اس کو سوار ہونا اور ڈوپٹہ اوڑھنا چاہئے[3]" اسی سبب سے قربانی کے لئے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہین ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جارہا ہے، فرمایا کہ اس پر سوار ہولو، اُس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ نے تین بار اسکو اونٹ پہ سوار

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۴۱ [2] ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع، [3] ترمذی کتاب النذور والایمان،

ہونے کی تاکید کی[5]،

۱۱- انصار حج کرکے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر مین نہین داخل ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے، اوراس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کرکے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر مین گھس آیا، تو لوگون نے اس کو بڑی لعنت وملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا	گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہین ہے، نیکی
وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ	صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا، اور گھرون
مِنْ اَبْوَابِهَا[2] (بقرہ - ۲۴)	مین دروازے کی راہ سے آو،

۱۲- بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقون سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک مین نکیل ڈال لیتے تھے، اوراس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت صلعم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے، تو اس کی نکیل کٹوادی[3]، اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے، اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ[4]، ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی مین جڑے ہوئے ہین، وجہ پوچھی تو دونون نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کرینگے، آپ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کرو یہ نذر نہین ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو[5]،

۱۳- اہل عرب ایام حج مین عمرہ نہین کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریان حج سے واپس آجائین، اور انکی پیٹھ کے زخم اچھے ہوجائین، اس وقت عمرہ جائز ہوسکتا ہے، لیکن رسول اللہ صلعم نے خاص ایام حج مین عمرہ کیا، اورعملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا[6]،

---

[1] بخاری جلد ۱ ص ۲۲۹ کتاب الحج [2] ایضاً ص ۲۴۲ [3] نسائی کتاب الحج صفحہ ۱۹۸ باب الکلام فی الطواف [4] بخاری کتاب الحج باب الکلام فی الطواف [5] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۳۸۶ [6] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ ،

۱۴۔ جاہلیت کے زمانہ مین کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے، وہ ان دنون تجارت نہین کرتے تھے اور اس کو طریقۂ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لئے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لیے آتے تھے وہ حج مین شریک نہین ہوتے تھے، بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازارون مین جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے، اسلام آیا تو یہ دونون طریقے الگ الگ جاری تھے، اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے، اور غیر حاجیون کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیون کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے جن مین ہر قسم کی برائیان جاری ہوتی تھین، اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا، اور کہدیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس و حرمت کے خلاف نہین، اس لئے یہ دونون فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہین، فرمایا[۱]،

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا	تمھارے لئے یہ گناہ نہین کہ (حج کے زمانہ مین)
مِّنْ رَّبِّكُمْ، (بقرہ - ۲۵)	فضلِ الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا، اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی،

۱۵۔ صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے، انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے، جو مشلل مین قائم کیا گیا تھا، اور طواف نہین کرتے تھے، اُنکے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانۂ کعبہ کے طواف کا حکم دیا، اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہین ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت صلعم سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہی؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[۲]،

[۲] صحیح بخاری کتاب الحج جلد اول صفحہ ۲۲۳ ۱۲

[۱] اس آیت کے شانِ نزول مین روایتین مختلف ہین، کچھ روایتون سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب حج مین تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لئے یہ آیت اتری، دوسری روایتون مین ہی کہ اہل عرب ان دنون تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لئے ہو گیا، اسلئے اب اس مین تجارت مناسب نہین، یہ آیت اس خیال کی تردید کے لئے اتری، لیکن تمام روایتون کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب مین لکھی گئی ہی، اور روایتون کے جمع کرنے سے اسکی تصدیق ہوتی ہی، (دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول واحدی مین آیت مذکورہ)

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ	صفا و مروہ خدا کا شعار ہین پس جو شخص حج یا عمرہ
حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ	کرے اس کے لئے ان دونون کا پھیرا لگانا گناہ
اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، (بقرہ - ۱۹)	نہین ہے،

حج کے ارکان اب اس اصلاح، ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتین حسب ذیل ہین،

احرام - تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہین، لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہین ہو سکتا، نماز کے لئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے، احرام بھی حج کی تکبیر ہے، احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت مین آجاتا ہے، اس لئے اس پر وہ تمام چیزین حرام ہو جاتی ہین جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھین، وہ شکار نہین کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کیلئے کسی جاندار کی جان لینا، بہرحال خود غرضی ہے، بی بی سے ہمتمتع نہین ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتون سے احتراز کا موقع ہے، سلے ہوے کپڑے نہین پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے لیکن خدا کی بارگاہ مین یہ بھی ایک بے ادبی تھی، اس لئے اسلام نے اس کو جائز نہین رکھا، اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوے کپڑون کو اتار دین اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا، زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لیجائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لیجائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کامون کے لئے باہر رہے، یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لئے اس وقت کے لئے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار مین حاضری کی وردی ہے، جو بالکل سادہ، بے تکلف، اور زیب و زینت سے خالی مقرر کی گئی ہے،

طواف یعنی خانہ کعبہ کے چارون طرف گھوم کر اور پھر کر دعائین مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے جو

حضرت ابراہیمؑ کے عہد مین نذر اور قربانی کو قربانگاہ کے چارون طرف پھرا کر ادا کیجاتی تھی، چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لئے وہ اس کے چارون طرف پھرتا ہے، اور اس گردش کی حالت مین وہ اپنی مغفرت کی دعائین اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے، جسکا ایک ضروری ٹکڑا آخر مین یہ ہوتا ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ "خداوندا ہم کو دنیا مین نیکی دے اور آخرت مین نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا"

طواف حقیقت مین ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ خانۂ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس مین بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت مین کچھ اور نہ بولو۔[1] اور حکم ہوا کہ

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ، (حج - ۴) اور اس پرانے گھر کا طواف کرین،

حجر اسود کا استلام، "حجر اسود" کے لفظی معنی "کالے پتھر" کے ہین، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانۂ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ مین قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانۂ کعبہ بیسیون دفعہ گرا اور بنا، کبھی سیلاب مین بہ گیا، اور کبھی آگ مین جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھون پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس مین باقی نہین مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا، جس کو اہلِ عرب نے جاہلیت مین بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام مین وہ اسی طرح نصب ہے، (الا یہ کہ ۳۱۷ھ مین باطنیہ اس کو کچھ دنون کے لئے نکال کر لے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار مین لگا ہے، جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہون تو بیت المقدس سامنے پڑیگا، اور اسی لئے حجر کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ مین اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانۂ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لئے وہ ایک نشان

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم،

کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں، یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کہنے کے لئے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے، نہ کوئی غیبی طاقت ہے، صرف ایک یادگاری پتھر ہے، مگر ایک مشتاقِ زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرّہ ذرّہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے مقدس لب، یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں، اور پھر تمام خلفائے راشدین، صحابۂ کرام، ائمۂ اعلام، اکابرِ اسلام اور حکمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے، اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے، اور با این ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے، جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار متوالے[1] نے اس کو چوم کر کہا "اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا[2]" الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اُس محبت کا نتیجہ ہے، جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے، نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا،

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں، جو گو اب برائے نام رہ گئی ہیں، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادیِ غیب

[1] یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، [2] صحیح مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب الاستلام،

کی آواز سے رُک گئے، اور اسمٰعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا، بعض روایتوں میں ہے، کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بیتاب ہو گئے تھے، تو حضرت ہاجرہ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں، اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا و مروہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہرحال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منھ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں، پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں، وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں، کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہ کو نظر آئے،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ	بیشک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں، تو جو خانہ کعبہ
حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ	کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس پر اس کا پھیرے لگانا
اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا، (بقرہ - ۱۹)	گناہ نہیں،

وقوفِ عرفہ۔ عرفات میں نویں ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا، اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا، اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے، اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں یہیں جبلِ رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے، اور اُن کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے، عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمایش ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز، حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دونوں میں مغفرت اور رحمتِ الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے، کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہجاتی ہے،

قیام مزدلفہ - حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ، اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے، اس لئے انھوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لئے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں، اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا اسلئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا،

فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ	تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا
عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ	کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے
وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ ۔	تم کو بتایا، اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے
(بقرہ ۲۵-)	ہوئے تھے،

منیٰ کا قیام - یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں"[1]، رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی، اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، اور ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا، اس لئے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لئے منتخب کیا جسکا نام منیٰ ہے، یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کیجاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے،

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ داداوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے، جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا، کہ بجائے

---

[1] موطا امام مالک، باب ماجاء فی النحر فی الحج،

خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے، اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات، اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے، فرمایا،

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (بقرہ ۲۵) خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو،

قربانی - یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اور اسکا فائدہ یہ ہے کہ منٰی کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بنجائے، جسمیں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو، اور فقراء، اور مساکین کو کھانا کھلائیں،

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ — اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے

عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ — جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (حج - ۴) کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ،

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہوسکے تو دس روزے رکھیں، کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے،

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ — تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو

مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ — جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے، جس کو یہ بھی میسر

اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ — نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں، اور سات

(بقرہ - ۲۴) — دن واپس ہو کر،

حلق راس - منٰی میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے، کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے[1]، ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدّن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا، کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اُس کے سر کے بال منڈا دیئے جاتے تھے، یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی[2]، چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی

[1] توراۃ قاضی ۱۳ - ۵ گنتی ۶ - ۵ [2] ابن سعد جزء ثانی قسم اول ص ۳۵ و سیرۃ ابن ہشام ذکر بیر معونہ، واقعہ عمرو ابن امیہ و جزء ناصیۃ اعتقہ،

کا اقرار و اعتراف ہے، اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی،

مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ ۔ (فتح-۴) اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر،

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ، (بقرہ-۲۴) اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے،

رمیِ جمار - منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا، انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا، جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں، اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا، اور اسی لئے شیطان کو "رجیم" یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہیں، صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی، تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا، جسکا ذکر سورۂ فیل کی آیت تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ میں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا، اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے، یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی تَرْمِيهِمْ کی سنگ باری کی یادگار ہے، خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو، ان ستونوں پر پھینکتے ہیں، اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرما دی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے[1]، قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے،

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ-۲۵) جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے تھے ویسے ہی خدا کو یاد کرو، بلکہ اس سے بڑھ کر

[1] مشکوٰۃ باب رمی جمار بحوالہ دارمی، و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح،

اسی رمیِ جمار پر مراسمِ حج کا خاتمہ ہوتا ہے،

ان رسوم کی غایت اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پُرانے عہد کے طریقِ عبادت کی یادگار ہین جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے، تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہون کے سامنے ہمیشہ قائم رہے، اور ہمارے جذبات و احساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہین، اور خدا کی یاد، اپنے گناہون کی مغفرت، اور آیندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیون مین جوڑ پیدا کرکے، تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا، "کہ کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے، اور خانۂ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد، خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہین ہے[1]"، اور قرآنِ پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے،

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ (حج-۴) اور تاکہ اُن مقررہ دنون مین خدا کا نام یاد کرو،

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہین، جہان پہنچکر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہین، اور اسی لئے قرآنِ پاک کی اصطلاح مین ان کا نام شَعَآئِرُ اللهِ اور حُرُمٰتُ اللهِ ہے، یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتین اور چیزین، اور انھین شعائر اللہ اور حرمٰت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۂ حج مین حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (حج-۴)	اور جو اللہ کی محترم چیزون کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے،

صفا و مروہ کی نسبت ہے،

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج،

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (بقرہ-۱۹) اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہین،

اور سورۂ حج مین فرمایا،

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا — یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ

مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ، (حج-۴) — دلون کی پرہیزگاری ہے،

ان آیتون سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتین وابستہ ہین، اُن کی یاد قائم رہے، اور دلون مین تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا ہے،

حج کے آداب حج کے لئے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی، اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے یہانتک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لئے جائز نہیں، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے،

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ، (بقرہ-۲۵)

تو جو ان مہینون مین حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج مین نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا، اور نہ جھگڑا کرنا ہے، اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے،

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ، (مائدہ-۱) حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت مین،

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہون، اُن کو راستہ مین تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا، کہ یہ اس خانۂ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تاکہ عرب جیسے بے امن ملک مین ان ڈاکوون اور رہزنون اور بدمعاشون کی وجہ سے قافلون کا آنا جانا نہ رُکے،

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا — اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والون کو

مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (مائدہ ۸-۱) حلال سمجھو، جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں،

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے جسکا نام کفارہ ہے، یعنی اُس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا،

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ۗ (مائدہ ۸-۱۳)

اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو، اور تم میں جو جانکر ماریگا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے مواشی میں سے، اسکا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں، کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کیجائے، یا اس کے گناہ کا اتارہ ہے، کچھ محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اسی کے برابر روزے تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے،

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمامتر صلح و سلامتی، اور امن و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے،

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے، اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں، بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے، نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفۂ ربانی میں مذکور ہیں،

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسمٰعیلؑ کی نذر اور مکہ مین اُن کے قیام کے سلسلہ مین جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کو جامع ہے، آیئے ان آیتون پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لین،

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا
وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى
وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ
طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَ
الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ، وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ
اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ،

(بقرہ ۷ - ۱۵)

اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگون کا مرجع
و مرکز اور امن بنایا، اور ابراہیم کے کھڑے ہونے
کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ، اور ہم نے ابراہیمؑ اور
اسمٰعیلؑ کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونون میرے گھر کو
طواف کرنے والون اور کھڑے ہونے والون
اور رکوع کرنے والون اور سجدہ کرنے والون
کے لئے پاک و صاف کرو، اور جب ابراہیمؑ نے
کہا، میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا،
اور اس کے رہنے والون کو پھلون مین سے روزی دے

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ
مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ، رَبَّنَا وَابْعَثْ
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ،

(بقرہ ۷ - ۱۵)

اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا تابعدار
گروہ بنا، اور ہماری اولاد مین سے کچھ کو اپنا فرمانبردار
گروہ بنا، اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا، اور
ہم کو معاف کر، تو بے شک معاف کرنے والا
اور رحم کرنے والا ہے، اور ان مین انہین مین
سے ایک رسول بھیجنا،

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ

اور جب ہم نے ابراہیمؑ کو یہ گھر کی جگہ ٹھکانا دی
کہ میرا شریک نہ بنانا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والون

لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ، وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

(حج - ۴)

کھڑے ہونے والون، رکوع کرنے والون اور سجدہ کرنے والون کے لئے پاک وصاف کر، اور لوگون مین حج کا اعلان کردے، وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہوجانے والی اونٹنیون پر سوار ہوکر، دور دراز راستہ سے آئین گے، تاکہ فائدے کی جگہون مین آکر جمع ہون اور چند مقررہ دنون مین اس بات پر خدا کا نام یاد کرین کہ ہم نے ان کو جانور روزی کئے،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ج فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ،

(ابراهيم - ۶)

جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس آبادی کو امن والی بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتون کی پوجا کرین، میرے پروردگار ان بتون نے بہت سے لوگون کو گمراہ کیا، تو جسنے میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار مین نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی مین تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے، ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی رکھین، تو لوگون کے کچھ دلون کو ایسا بنا کہ وہ انکی طرف جھکین، اور انکو پھلون کی روزی دے تاکہ شکر گذار ہون،

ان آیتون مین حسب ذیل باتون کی تصریح ہے،

۱- خانہ کعبہ اہلِ توحید کا ایک مرکز و مرجع، اور ملتِ ابراہیمی کا موطن و مسکن ہی،

۲- حضرت ابراہیمؑ نے یہان اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گذاری اور خداے واحد کی عبادت کرتی رہے، اور بت پرست قومون کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے، اور آخر ان مین وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتین ایسی ہون،

۳- یہ لوگ ایک ویرانہ مین جسمین کھیتی نہین آباد ہوئے ہین، اور صرف اس غرض سے آباد ہوے ہین کہ تیرے گھر کو آباد رکھین، تو تو اس بے ثمر اور شور زمین مین ان کی روزی کا سامان کرنا، اور لوگون کے دلون کو ان کی طرف جھکانا، کہ وہ ان سے محبت کرین،

۴- حکم ہوا کہ لوگون مین اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہین گے تاکہ یہان آکر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کرین، اور چند مقررہ ایام مین خدا کا نام لین،

۵- جو لوگ یہان عبادت اور حج کی نیت سے آئین، خداوندا! تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان اور رحیم ہے،

۶- خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لئے تمام وہ لوگ جو ملتِ ابراہیمی کے پابند ہون، آلِ ابراہیمؑ ہین، اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤن اور برکتون کے مستحق ہین،

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہین جن مین سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد و اغراض ہین،

مرکزیت - خانہ کعبہ اس دنیا مین عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتون اور برکتون کا نقطۂ قدم ہے، یہ وہ آئینہ ہے جس مین اس کی رحمت و غفاری کی صفتین اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعون سے منور کرتی ہین، یہ وہ منبع ہے جہان سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا، اور اُس نے تمام دنیا کو سیراب کیا، یہ روحانی علم و

معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنون نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشان کیا، یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے، جسمین ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہین، جو مختلف ملکون اور اقلیمون مین بستے ہین، مختلف زبانین بولتے ہین، مختلف لباس پہنتے ہین، مختلف تمدنون مین زندگی بسر کرتے ہین، مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات، اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہین، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہین، اور ایک ہی مقام کو اُمّ القُریٰ مان کر، وطنیت، قومیت، تمدّن ومعاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آلِ ابراہیم) ایک ہی تمدّن ومعاشرت (ملتِ ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) مین متحد ہو جاتے ہین، اور یہ وہ برادری ہے جس مین دنیا کی تمام قومین اور مختلف ملکون کے بسنے والے، جو وطنیت اور قومیت کی لعنتون مین گرفتار ہین، ایک لمحہ اور ایک آن مین، داخل ہوتے ہین، جس سے انسانون کی بنائی ہوئی تمام زنجیرین اور قیدین اور بیڑیان کٹ جاتی ہین اور تھوڑے دن کے لئے عرصۂ حج مین تمام قومین ایک ملک مین، ایک لباسِ احرام مین، ایک وضع مین، دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہین، اور ایک ہی بولی مین خدا سے باتین کرتی ہین، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے، جو انسانون مین جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کے اسباب ہین، اس لئے یہ حرمِ ربانی نہ صرف اسی معنی مین امن کا گھر ہے، کہ یہان ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قومون کی ایک برادری قائم کرکے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہین، مٹا دیتا ہے، لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہین کہ قومیت ووطنیت کی تنگنائیون سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد مین داخل ہون، مگر ملتِ ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملتِ محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑون ہزارون برس پہلے اس خواب کو دیکھا، اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد وکوشش مین مصروف ہین، مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آلِ ابراہیم

کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے، لوگ آج دنیا کی قومون مین اتحاد پیدا کرنے کے لئے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہین، لیکن جہانتک مسلمانون کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا مین قائم ہے، اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے، آج دنیا کی قومین "ہیگ" (ہولینڈ) مین اقوامِ عالم کی مشترکہ عدالتگاہ کی بنیاد ڈالتی ہین، لیکن اس کے فیصلون کو کسی طاقت سے منوا نہین سکتین لیکن مسلمان اقوامِ عالم کے لئے یہ مشترکہ عدالتگاہ ہمیشہ سے قائم ہے، جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے، جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہین،

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظمِ حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے، یہ حج کا موسم اُن کی سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس مین امورِ خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے، اسپین سے لیکر سندھ تک مختلف ملکون کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے، اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے، اور طریقِ عمل طے کرتے تھے، اور مختلف ملکون کی رعایا آکر، اگر اپنے والیون اور حاکمون سے کچھ شکائتین ہوتی تھین، تو ان کو خلیفہ کی عدالت مین پیش کرتی تھی، اور انصاف پاتی تھی،

غالبًا یہی وجہ ہے کہ مسائلِ حج کے فورًا ہی بعد، اللہ تعالیٰ نے ملک مین فساد اور بے امنی کی برائی کی، اور فرمایا

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ، (بقرہ ۔ ۲۵)	بعضے آدمی ایسے ہین کہ اُن کی بات دنیا کی زندگی مین بھلی معلوم ہوتی ہے، اور جو اس کے دل مین ہے اُسپر وہ خدا کو گواہ بناتے ہین، حالانکہ وہ پرلے درجہ کے جھگڑالو ہین، اور جب پیٹھ پھیرین تو ملک مین دوڑتے پھرتے ہین، کہ اُسمین بے امنی برپا ہو، اور تاکہ کھیتیان اور جانین تلف ہون، اور اللہ فساد پیدا کرنے کو نہین پسند کرتا۔

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا،

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۔ (بقرہ ۔ ۲۵)

اے ایمان والو تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو، کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے،

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور دراز اقلیموں، ملکوں، اور شہروں میں اُس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا، اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا، ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیکدفعہ خطاب کیا اور سب نے سمعاً و طاعۃً کہا، آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے خلفاء نے زمانۂ صحابۂ کرامؓ اور ائمۂ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکامِ اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے، اور پہنچتے رہتے ہیں،

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر، اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آکر یہاں سمٹ جاتے تھے، اور تمام دنیا کے گوشوں سے آکر حرمِ ابراہیمؑ میں جمع ہو جاتے تھے، اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا، ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے یہیں آکر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی، سندھی، (ہندوستان) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا، اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں، اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں، اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام

مین پہنچ جاتا تھا، ابن مسعودؓ کے شاگرد ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے، اور ابن عباسؓ کے مسترشد ابو ہریرہؓ کے مستفیدون سے، اور انسؓ کے حلقہ کے فیضیاب علیؓ کے شاگردون سے مستفید و سیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا، جہان ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے، اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابۂ کرام اور اُن کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا مین پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرامین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہوگیا، اور آپ کے سیر و مغازی، اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آگئین، اور موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود مین آئے، اور ائمہ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے امامون کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجماعی مسائل کو الگ کر سکین، اور اس سے پہلے کہ کتابین مدون ہون اور پھیلین ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکے اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے،

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکون مین اپنے اپنے حالات مین گرفتار ہین، وہ دور دراز مسافتون کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتون کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی، اور صحرا کو عبور کر کے یہان جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہین، جس سے ان مین باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے، یہین آکر چینی مراکشی سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے، جاوی بلغاری سے ملتا ہے، اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہین،

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، زمانۂ

کے رنگ کو پہچاننے، اور سیاسیات کی پیچیدگیون کو سمجھنے لگتا ہے، بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہو، اور دنیا کے ہر اُس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیاے اسلام اور اسلامی ملکون کے حالات و واقعات کے لئے بےچین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانون کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملیگی، جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا، اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے مین سفرِ حج نے بہت کچھ مدد کی ہے، مسلمانون مین بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیّاح گذرے ہین، جنھون نے اصل مین حج کی نیت سے سفر کیا، اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کرلی، یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ مین، مسلمانون مین جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفرِ حج کو قرار دیا ہے،

رزقِ ثمرات - اس مرکز کو قائم، اور آباد رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس شور و ویرانے مین بسنے والون کے لئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی، کہ "خداوندا مین نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب وگیاہ سرزمین مین آباد کیا ہے، تو لوگون کے دل اُنکی طرف جھکانا، اور اُن کے رزق کا سامان کرنا، اور اُن کو پھل کی روزی دینا" اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی، کہ یہان کے بسنے والون کے لئے زکوٰۃ وخیرات کی کوئی رقم خاص کیجاتی، لیکن یہ اُن لوگون کی اخلاقی پستی اور دونِ فطرتی کا سبب ہوجاتی، وہ لوگون کی نظرون مین ذلیل وخوار ہوجاتے، جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلون مین تجارت کا شوق پیدا کیا، اور اس کو اُن کی روزی کا سامان بنا دیا، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کا جہان کہین پرانی تاریخون مین وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس مین ملتی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ مین جو حضرت اسمٰعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ

کے بیٹے تھے، بنی اسمٰعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے، (تکوین ۳۷-۲۸ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات مین عرب سوداگرون اور تاجرون کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے، جس کا ذکر سورۂ "لایلاف قریش" مین ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر و روم تک جاتے تھے[1]،

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لئے کافی نہ تھی، اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا، اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا، کہ یہ دعاے ابراہیمی کا مصداق، اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والون کے لئے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہان آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے مین یہان کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہین، کہ وہ سال بھر کھا پی سکین، مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے، تو پورے راستہ اور منزلون کے بدو اپنے پھل اور پیداوارے کراتے ہین، اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہین، کھانا، پینا، مکان، سواری اور دوسرے ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہین، اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہین، اور آخر یہی زرِ معاوضہ اہلِ مکہ کے قُوتِ لایموت کا ذریعہ بنتا ہے،

قربانی کی اقتصادی حیثیت اس ملک کی فطری پیداوارون مین اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانورون کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہلِ عرب اور اہلِ بادیہ کے لئے ان جانورون سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا، ہر سال تقریبًا ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہین، جنمین سے بعض کئی کئی کرتے ہین اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانورون سے کم کی قربانی نہین ہوتی، اور عمومًا دنبہ کی قیمت آٹھ روپیے، اور بکری کی چار روپیے وہان ہوتی ہے، تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپیے ہر سال اہلِ بادیہ کو اپنے

[1] تفصیل اور حوالون کے لئے دیکھو میری تالیف ارض القرآن جلد دوم باب تجارات العرب قبل الاسلام،

جانورون کی فروخت سے ملتے ہین، اور یہ اس بے آب وگیاہ اور ویران ملک کے باشندون کی بہت بڑی مدد ہے

ابراہیمی دعا کی مقبولیت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا مین خاص طور سے پھلون کا ذکر کیا تھا،

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ، — اور یہان کے رہنے والون کو پھلون مین سے روزی دینا، (بقرہ - ۱۵)

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازارون مین ہر وقت تازہ سے تازہ پھل میوے سبزی اور ترکاریان نظر آتی ہین، اور دعاے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہین کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے،

تجارت، قرآن پاک کے محاورہ مین خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے، اللہ تعالی نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصولِ رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ مین ہے

وَلَا آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا، — اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہون، اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے، (مائدہ - ۱)

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہین، کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائیگا، تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لئے اسلام کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر مین تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہین سمجھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگون سے بھیک مانگ مانگ کر حج کرنا اچھا نہین، کہ یہ تقوی کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے، فرمایا۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ، لَيْسَ عَلَيْكُمْ — اور راہ کا توشہ (خرچ) لیکر چلو، کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقوی (بھیک نہ مانگنا) ہے،

جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ — تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل

(بقرہ - ۲۵) — تلاش کرتے ہوئے چلو، (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر مین جائز نہین، درست نہ تھا، کہ اول تو "طلب رزق" ہرحال مین بجائے خود اسلام مین عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد مین ہے، کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی، ترقی اور بقا ممکن نہین یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانۂ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے، جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے، یہ مقام گویا مسلمانون کی عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز، اور ممالکِ اسلامیہ کی صنعتون کی سالانہ نمایشگاہ ہے، جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہان کی صنعت کا نمونہ یہان دیکھنے والے کو نظر نہین آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آجکل کے مسلمانون نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے، اور کچھ غیر مسلمانون کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دب بھی ہین، اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکون کا مرکزی بازار تھا یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے، اس جنگِ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہین،

روحانیت - روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتین ہین جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب و روح مین پیدا ہوتی ہین، اُن کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی، اور تیسری خالص روحانی ہے، وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک مین رہتے، ہر زبان بولتے، اور ہر لباس پہنتے ہین، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہین ہون، تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے، وہی ملتِ ابراہیمی کا مقام، اسلام کا مولد، اور قرآن کا مہبط ہے، اس لئے دور دراز مسافتون سے ولولہ اور شوق کے بازوون سے اڑکر جب لوگ یہان پہنچتے ہین، تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے، اور اُن کے دل مین اسلام کے

وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک مین بھی ہے، اس کو وہان اسلام اپنے خالص وطن مین نظر نہین آتا، ہرجگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومین بھی نظر آتی ہین، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہین، اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنون کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہان اسلام اُس کو اپنے خالص رنگ مین جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد وپیش آگے پیچھے، داہنے بائین، ہرطرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ مین ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوآبادیون کے رہنے والون کی نگاہ مین اپنی مادر وطن (مدرلینڈ) کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزیلینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار، اور افریقہ اور کنیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکون مین آباد ہین، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ اُن کی نگاہ مین اس وسیع برطانی مملکت کا جس مین آفتاب نہین غروب ہوتا مرکز ہے، وہ اُن کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر، ہر چیز مین اپنے اس آبائی وطن ومسکن کی پیروی کرتے ہین، جب ان کی آنکھین اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہین، تو اپنی خالص اور بےمیل تہذیب، اخلاق، اور تمدن کے ملک کو دیکھکر مسرت اور خوشی سے روشن ہوجاتی ہین، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہین، اس وقت انکے دل مین وہ احساسات پیدا ہوتے ہین، جو دوسرے ملکون، قومون، اور تمدنون مین رہنے کی وجہ سے انکی فسردہ اور پژمردہ ہوجانے والی فکر اور عمل کی قوتون کو بیدار کردیتے ہین، اور وہ یہان آکر اپنی خالص تہذیب وتمدن کے پاک وصاف چشمۂ حیات مین نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہوجاتے ہین، بلاتشبیہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانون کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم وفنون کا مولد ومسکن سمجھتے ہین، ان مین سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے، تو اُس کا ذرّہ ذرّہ اس زائر کے دامنِ دل سے لپٹ جاتا ہے، اور وہ چلا اٹھتا ہے،

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم،
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک مین اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے، اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائین، تاکہ یہان اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک وصاف، اور کفر وشرک کی ہر قسم کی نجاستون سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہان آکر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل، اور روحِ ایمانی کو تازہ کرسکین، قرآنِ پاک نے مکہ معظمہ کو "ام القریٰ" یعنی "آبادیون کی مان" کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیون کی مان اور اصل، و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے،

تاریخیت۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرمِ پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے، آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لیکر محمد رسول اللہؐ تک جو کچھ ہوا ہے، اس کا تمامتر تعلق ارضِ حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے یہین حضرت آدمؑ نے سکونت کی، اور عرش کے سایہ مین خدا کا گھر بنایا، یہین حواؑ نے آکر ان سے ملاقات کی، یہین نوحؑ کی کشتی نے آکر دم لیا، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہان پناہ لی، حضرت ابراہیمؑ نے یہان ہجرت کی، حضرت اسمٰعیلؑ نے یہین سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہان ولادت پائی، یہین وہ پہاڑی ہے (صفا) جہان حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہین وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی، یہین وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے عالم مین نظر آیا، یہین وہ خانۂ خدا ہے جس کی چار دیواری کو ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہین وہ مقام ہے جہان کھڑے ہوکر انھون نے خدا کے آگے سر جھکائے، اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام، اور عرفات ہین، جو شعائر اللہ ہین

یہین وہ پتھر (حجر اسود) ہے، جو ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھون سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے، جہان ملتِ ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے، جہان اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، یہین وہ گلیان اور راستے ہین، جو جبریلِ امین کے گذرگاہ تھے یہین وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحنِ حرم ہے جس مین محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترپن سال بسر کئے، اور یہی وہ مقام ہے، جہان براق کے قدم پڑے تھے، اور یہی وہ مکانات ہین جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآنِ پاک کا اشارہ انھین مناظر اور مشاہد کی طرف نہین، جہان اس نے کہا،

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ (آل عمران - ۱۰) — اس حرم مین کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہین، ابراہیم کے قیام کی جگہ،

ان مقامات اور مناظر مین کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے، تو اس کے ادب کی آنکھین نیچی ہو جاتی ہین، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ مین تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھین اشکبار ہوتی ہین، اور زبان تسبیح و تہلیل مین مصروف ہو جاتی ہے، اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے،

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ، (حج - ۴) — اور جو خدا کی نشانیون اور یادگارون کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلون کے تقوی کے سبب سے ہے،

وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهِ، (حج - ۴) — اور جو خدا کی حرمتون کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے،

خالص روحانیت - "حج کی حقیقت" مین گذر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی، اور اس دوڑ دھوپ

کا نام نہین، یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادّی شکل ہے، حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات کیفیات، اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلین ہین، اسی لئے سرورِ کائنات علیہ الصلوٰت نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہین بلکہ "حجِّ مبرُور" رکھا ہے، یعنی "وہ حج جو سراپا نیکی ہو" اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتون کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلون کے لئے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت، اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد، اور آیندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے، اور اس کا اشارہ خود دعاے ابراہیمی مین مذکور ہے،

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ	اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار
مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص	(مسلم) بنا، اور ہماری اولاد مین سے اپنا ایک فرمانبردار
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ	گروہ بنا، اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ،	سکھا، اور ہم پر رجوع ہو، (یا ہم کو معاف کر) تو
	بندون کی طرف) رجوع ہونے والا (یا اُن کو
(بقرہ - ۱۵)	معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے،

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی، ان کی دوسری دعاؤن کیطرح ضرور قبول کیگئی ہو اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین مین حاضر ہوکر، جہان اکثر نبیون، رسولون اور برگزیدون نے حاضر ہوکر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے، اور ان مقامات مین کھڑے ہوکر، اور چل کر خدا کی بارگاہ مین اپنی سیہ کاریون سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوے مولیٰ کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو، کہ وہ تو اپنے تائب گنہگارون کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم وکرم، لطف وعنایت کا بحرِ بیکران ہے،

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ گناہون کو اس طرح صاف

کر دیتے ہین، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے، اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت مین گذارتا ہے، اس کا سورج جب ڈوبتا ہے تو اسکے گناہون کو لے کر ڈوبتا ہے[1]"

صحیح مسلم اور نسائی مین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہین جس مین خدا اپنے بندون کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو، وہ اس دن اپنے بندون سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے، اور اپنے اُن بندون پر فرشتون کے سامنے فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ جو انھون نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا)" موطا امام مالک مین ہے کہ آپ نے یہ خوشخبری سنائی کہ "بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا، اور غضبناک نہین ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہین" اسی طرح اور بہت سی حدیثین ہین جنمین مخلصانہ حج ادا کرنے والون کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثین درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا (اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا، اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیرین ہین،

ان تمام بشارتون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ "خداوندا مین حاضر ہون مین حاضر ہون" کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے، طواف مین، سعی مین، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات مین، مزدلفہ مین، منٰی مین ہر جگہ جو دعائین مانگی جاتی ہین اُن کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے، اور اس بنا پر کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ[2] "گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہین" اسیلئے حج مبرور والون کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہین،

---

[1] نسائی و ترمذی و بزار و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد کتاب الحج جلد اول ص۱۶۳ میرٹھ [2] سنن ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ،

گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہین، اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہین لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گوناگون تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہان کے سوا اور کہین نہین، صدقِ توبہ کے لئے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہین، ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب مین ہے، اسکا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہان انبیاء علیہم السلام پر برکتون اور رحمتون کا نزول اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گنہگارون کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا، وزاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہان خدا اور اس کے برگزیدہ بندون کے بیسیون ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہین، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین موقع ہین، جہان حضرت آدم و حوا نے اپنے گناہون کی معافی کی دعا کی جہان حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اور اپنی اولاد کے لئے دعا مانگی، جہان حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہان دوسرے پیغمبرون نے دعائین کین، جہان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لئے دعائین مانگین، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤن کے وہی ارکان، ہم گنہگارون کی دعاے مغفرت کے لئے کس قدر موزون اور مناسب ہین کہ پتھر سے پتھر دل بھی، ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لئے تیار ہو جاتے ہین، اور انسان اُس ابرِ کرم کی چھینٹون سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہان برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے، اور ہنوز آن ابرِ رحمت دُرفشان است،

انسان کی نفسیت (سائکلوجی) یہ ہے، اور روزمرہ کا تجربہ اسکا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی مین کسی بڑے اور اہم تغیر کے لئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدِ فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہان پہنچکر اسکی گذشتہ اور آیندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائین، اسی لئے لوگ اپنے تغیر کے لئے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہین، بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحبِ اولاد ہونے کے بعد، یا تعلیم

سے فراغت کے بعد، یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد، یا کسی سے مرید ہوجانے کے بعد بدل جاتے ہین، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہوجاتے ہین، کیونکہ اُن کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی مین فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہین، جہان سے اِدھر یا اُدھر مڑجانا ممکن ہوجاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتا ہے، اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہان سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کرکے نئی زندگی شروع کرتا ہو اُن بابرکت مقامون پر حاضر، اور وہان کھڑے ہوکر، جہان جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصانِ الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے، قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازون اور عقیدتون اور مناجاتون کی غائبانہ سمت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیون پر ندامت اور اپنے گناہون کا اعتراف، اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف، خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے، اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہوکر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی لئے سرورِ کائنات علیہ الصلوات نے یہ فرمایا:

من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق رجع	جس نے خدا کے لئے حج کیا، اور اس مین ہوس رانی
کیوم ولدتہ امہ[1]	نہ کی، اور نہ گناہ کیا، تو وہ ایسا ہوکر لوٹتا ہے جیسے
	اس دن تھا جس دن اُسکی مان نے اُسکو جنا،

یعنی ایک نئی زندگی، ایک نئی حیات، اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس مین دین اور دنیا دونون کی بھلائیان جمع اور دونون کی کامیابیان شامل ہونگی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتون کا خلاصہ ہے، جو حج کے باب مین ہین، اور جس کی آخری آیتین، طواف کی دعا، کا آخری ٹکڑہ ہین،

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج مین یہ حدیث موجود ہے،

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ
وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ
كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا
فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي
الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ
وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ، أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ
مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔

(بقرہ ۲ - ۲۵)

پھر طواف کے لئے وہین سے چلو جہان سے لوگ
چلے، اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو بیشک
خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے،
اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ
کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادون
کو یاد کرتے ہو، یا اُن سے بھی زیادہ، تو بعض لوگ
(حج کی دعا مین) کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار
ہم کو دنیا مین دے، اور ایسون کے لئے
آخرت مین کوئی حصہ نہین، اور بعض وہ ہین
جو کہتے ہین کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا
مین بھلائی دے اور آخرت مین بھی بھلائی دے
اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہین جنکو
اپنی کمائی کا حصہ ملے گا، اور اللہ تمہارے اعمال کا
تم سے جلد حساب لینے والا ہے،

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہین، مثلاً:-

۱- حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریون کا احساس کر سکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لئے آدمی حج کیلئے اُس وقت نکلتا ہے، جب اہل و عیال کی ضرورتون کا سامان کر لیتا ہے، اس لئے اس کو اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریان خود بخود محسوس ہو جاتی ہین، معاملات مین قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے، اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے

سبکدوش ہو جائے، اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے،

عام طرز معاشرت اور دنیوی کامون مین آدمی اپنے سیکڑون دشمن پیدا کر لیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ مین جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے، اس لئے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگون سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھون کو مناتا ہے، قرضخواہون کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے،

۲- اسلام آج ہر ملک مین ہے، اس لئے ہر ملک کی زبان اسکی زبان ہے، تاہم اسکی ایک عمومی زبان بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے، جہان دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہین، اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر مین کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہین، اسکا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو، وہ اُس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے، اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے،

۳- مساوات اسلام کا سنگِ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کیساتھ اسکی اصلی نمائش حج کے زمانہ مین ہوتی ہے، جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا، ایک لباس مین، ایک صورت مین، ایک میدان مین، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہین، نہ کسی کے لئے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید،

۴- بہت سی اخلاقی خوبیون کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف مین مالِ حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے اس کو خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے، اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے،

الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہین، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانون کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے،

جہاد

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج - ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہا، کی تحریروں میں نہیں آتا، مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اسکی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے، اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو توبرتو پردے پڑ گئے ہیں اُن کو اٹھایا جائے،

"جہاد" کے معنی عموماً قتال، اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے، "جہاد" کا لفظ "جہد" سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں، اور لغت میں اسکے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی، اور اسکی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی، اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی ومالی ودماغی قوتوں کو جو اللہ تعالی کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہانتک کہ اس کے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کی، اہل وعیال کی، خاندان وقوم کی جان تک کو قربان کردینا، اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائگان کرنا، ان کے حملوں کو روکنا، اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں اگر اُن سے لڑنا پڑے، تو اس کیلئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے، اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے،

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے، صرف "دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ" کے تنگ میدان میں محصور کردیا ہے،

یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لیکر دنیا مین آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہین، بلکہ عمل اور سراپا عمل ہے، آپ کے مذہب مین نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہین بلکہ خدا کی توحید، رسولون اور کتابون اور فرشتون کی سچائی، قیامت اور جزا وسزا کے اعتقاد کے بعد انھین کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لئے قرآن پاک مین "جہاد" کا مقابل لفظ "قعود" (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے، سورۂ نساء مین ہے،

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۚ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (نساء ۱۳)

مسلمانون مین سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو اور پھر بیٹھے رہین، اور وہ جو خدا کی راہ مین اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہون، برابر نہین، اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والون کو بیٹھنے والون پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے، اور جہاد کرنے والون کو بیٹھنے والون پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس "بیٹھنے" اور "جہاد" کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے، کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے،

یہان ایک شبہہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہین کہ "جہاد" اور "قتال" دونون ہم معنی ہین حالانکہ ایسا نہین ہے، قرآن پاک مین دونون لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہین، اسلئے "جہاد فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین جہاد کرنا) اور "قتال فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ مین لڑنا) ان دونون لفظون کے ایک معنی نہین ہین، بلکہ ان دونون مین عام و خاص کی نسبت ہے یعنی ہر "جہاد" "قتال" نہین ہے، بلکہ جہاد کی مختلف قسمون مین سے ایک "قتال اور دشمنون

سے بڑا بھی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک مین ان دونون نقطون کے استعمال مین ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اسی سورۂ نسا، کی اوپر کی آیت مین اور دوسری آیتون مین جہاد کی دو صریح قسمین بیان کی گئی ہین، جہاد بالنفس، اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لیے، ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہانتک کہ اپنی جان تک کو جوکھون مین ڈال دینے، آگ مین جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے مین چھد جانے، اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت، شخص اور قوم دونون کی ترقی وسعادت کی راہ مین رکاوٹ ہے، اگر یہ دونون بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائین تو ہم کامل موحد ہو جائین، اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہین سکتی، جسمانی وروحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہین،

ترقی وسعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا، اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصولِ ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ مین مسلمانون نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفون کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سِل، طوق وزنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچون سے علٰحدگی، مال ودولت سے دست برداری، اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی اُن کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ مین انھون نے تلوار کی چھاؤن مین جس طرح گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے،

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ	مومن وہی ہین جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ	لائے، اور پھر اس مین وہ ڈگمگائے نہین، اور
وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ	خدا کے راستہ مین اپنی جان سے اور اپنے مال سے

هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ، (حجرات - ۲)

جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہین،

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ، الآیۃ

(آل عمران - ۲۰)

پھر جنھون نے اپنا گھر بار چھوڑا، اور اپنے گھرون سے نکالے گئے، اور میری راہ مین ستائے گئے، اور لڑے اور مارے گئے مین اُن کے گناہون کو اتار دونگا، اور ان کو بہشت مین داخل کرونگا،

جہاد کی قسمین ۱- جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ، اور جد وجہد کے ہین تو ہر نیک کام اس کے تحت مین داخل ہوسکتا ہے، علماے دل کی اصطلاح مین "جہاد" کی سبسے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے، اور اسی کا نام اُن کے ہان "جہاد اکبر" ہے، خطیب نے تاریخ مین حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے، کہ آپ نے اُن صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے، فرمایا "تمھارا آنا مبارک، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو، کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہواے نفس سے لڑنا ہے" حدیث کی دوسری کتابون مین اس قسم کی اور بعض روایتین بھی ہین۱؎، چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے" یہی روایت دیلمی مین ان الفاظ مین ہے کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو" یہ تینون روایتین گو فن کے لحاظ سے چندان مستند نہین ہین، مگر یہ درحقیقت بعض صحیح حدیثون کی تائید، اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہین،

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ،

(عنکبوت - ۷)

اور جنھون نے ہمارے بارہ مین جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائین گے، اور بے شبہہ خدا نیکوکارون کے ساتھ ہے،

اس پورے سورہ مین اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف مین ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیغمبرون کے کارنامون کو ذکر کیا ہے، کہ وہ ان مشکلات مین کیسے ثابت قدم رہے،

۱؎ تا ۳؎ کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۲۰۵ حیدرآباد دکن،

اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز مین ہے،

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ،	اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لئے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والون سے بے نیاز ہے،
(عنکبوت - ۱)	

اور سورہ کے آخر مین فرمایا کہ "ہمارے کام مین یا خود ہماری ذات کے حصول مین، یا ہماری خوشنودی کی طلب مین جو جہاد کریگا اور محنت اٹھائیگا ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دینگے، اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائین گے"

یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیون کا وسیلہ ہے، سورۂ حج مین ارشاد ہوا،

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرٰهِيْمَ ، (حج - ۱۰)	اور محنت کرو اللہ مین پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے، اور تمھارے دین مین تم پر کوئی تنگی نہین کی تمھارے باپ ابراہیم کا دین،

یہ "اللہ مین محنت اور جہاد کرنا" وہی جہادِ اکبر ہے، جس پر ملتِ ابراہیمی کی بنا ہے، یعنی حق کی راہ مین عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان مین ہے[1]، کہ آنحضرت صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ "المجاهد من جاهد نفسه" یعنی مجاہدہ وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے" صحیح مسلم مین ہے، ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ "تم پہلوان کس کو کہتے ہو" عرض کیا "جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکین" فرمایا "نہین پہلوان وہ ہے جو غصہ مین اپنے نفس کو قابو مین رکھے"[2] یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے، اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑا خود اس کے سینہ مین ہے،

۲- جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے، تو اس کا فرض ہے کہ وہ

---

[1] بحوالۂ کنز العمال، کتاب الایمان جلد ۱ صفحہ ۳۹، [2] صحیح مسلم باب من یملک نفسہ عند الغضب جلد ۲ صفحہ ۲۹۱ مصر،

اس سے دوسرے تاریک دلون کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب مین وہ طمانیت نہین پیدا ہوسکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگون کے سینون مین پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا کہ،

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (نحل - ۱۶)

تو لوگون کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتون کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے، اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر،

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے، اور اسی طریقۂ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت، اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریون کی فوجون کو شکست دینے کے لئے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ مین دی گئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پرون کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا،

فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا (فرقان - ۵)

تو کافرون کا کہا نہ مان، اور بذریعہ قرآن کے تو ان سے جہاد کر، بڑا جہاد،

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر" بڑا جہاد" اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر مین کتنی ہے، علمار نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے، اور اس کو جہاد کا اہم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن مین اس پر لطیف بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونون سے بڑھ کر ہے[1] ایک ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لئے عقل فہم علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو

---

[1] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ ص ۱۱۹،

اس راہ مین صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ مین کام آسکتے ہون، اُن کو اس لئے حاصل کرے کہ اُن سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائیگا، یہ علم کا جہاد ہے، جو اہلِ علم پر فرض ہے،

۳- جہاد بالمال،

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستون مین خرچ کیا جائے، یہان تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسایش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیے پر موقوف ہین، اس لئے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہین ہے، دوسری اجتماعی تحریکون کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدّ و جہد مین سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانون کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابۂ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سی سخت گھڑیون مین جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہین، اور انھین سیرابیون سے دینِ حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھون سرسبز و شاداب ہوا اور اسی لئے اسلام مین ان بزرگون کا بہت بڑا رتبہ ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (انفال-۱۰)

بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا،

قرآن پاک مین مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتین ہین، بلکہ بمشکل کہین جہاد کا حکم ہوگا، جہان اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ ان مین سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے مین جہاد کرو، یہ تمھارے

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ، (توبہ - ۶)	لئے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو،
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	مومن وہی ہین، جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	اس مین شک نہین کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ	سے خدا کے راستہ مین جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے
(حجرات - ۲)	ہین،
فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والون کو اللہ نے
عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ، (نساء - ۱۳)	بیٹھ رہنے والون پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے،

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتین ہین،

میدانِ جنگ مین ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لئے ممکن نہین لیکن مالی شرکت ہر ایک کیلئے آسان ہے،

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت نہین پیش آتی ہے لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے

انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اُس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے،

گر جان طلبی مضایقہ نیست گر زر طلبی سخن درین است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھکر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

۴- جہاد کے ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادا مین اپنی جان و مال و دماغ کی قوت

صرف کرنے کا نام بھی اسلام مین جہاد ہے، عورتین حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آکر عرض کرتی ہین کہ یا رسول اللہ

ہم کو غزوات کے جہاد مین شرکت کی اجازت دیجائے، ارشاد ہوا کہ "تمہارا جہاد نیک حج ہے"[1] کہ اس مقدس سفر کیلئے

سفر کی تمام صعوبتون کو برداشت کرنا، صنفِ نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت

اقدس مین اس غرض سے حاضر ہوتے ہین کہ کسی لڑائی کے جہاد مین شرکت کرین، آپ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد،

تمہارے ماں باپ ہیں، عرض کی جی ہاں، فرمایا ففیھما فجاھد، تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو[1] یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپ نے فرمایا،

اِنَّ من اعظم الجھادِ کلمۃُ عدلٍ عند سلطانٍ جائرٍ (ترمذی ابواب الفتن)	ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہدینا ہے،

۵۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے اُن تمام اقسام کو شامل ہے، جنمیں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اسکی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تُل جائیں تو اُن کو راستہ سے ہٹانا، اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لئے اسکو بخش دیجائے یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دیجائے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ،	جو خدا کی راہ میں مارے گئے، اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمکو اس کا احساس نہیں،

(بقرہ - ۱۹)

آل عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کیگئی ہے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ	جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس اُن کو روزی دیجارہی ہے، خدا نے اُن کو اپنی جو مہربانی

[1] ابوداؤد و ترمذی کتاب الجہاد،

بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ	عطا کی ہے، اس پر وہ خوش ہین، اور جو ابتک اُن سے
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ،	اس زندگی مین ہونے کی وجہ سے نہین ملے ہین اُن کو
(آل عمران - ۱۷)	خوشخبری دیتے ہین کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوا نہ وہ غم مین ہین

ان جان نثارون کا نام شریعت کی اصطلاح مین شہید ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندۂ جاوید ہین،

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگون پیراہن مین قیامت کے دن اٹھینگے[1]، اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی مین انھون نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی مین پائین گے، وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (آل عمران-۱۴)
اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھکر میدان مین اترے تھے، لیکن اُن کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی مین اسوقت اس لئے قبول نہ ہوا، کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہین ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسن نیت کے بدولت رضائے الٰہی کی سند پائین گے، اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لئے "غازی" کے لقب سے یاد کرتے ہین،

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ	اور جو خدا کی راہ مین لڑتا ہے، پھر وہ یا مارا جاتا ہے
فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا، (نساء-۱۰)	یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم اُسکو بڑا بدلہ عنایت کرینگے،
فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ	تو جنھون نے میری خاطر گھربار چھوڑا اور اپنے گھرون
وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ	سے نکالے گئے، اور اُن کو میری راہ مین تکلیفین دی گئین
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	اور وہ لڑے اور مارے گئے، ہم اُن کے گناہون
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	کو چھپا دینگے، اور اُن کو جنت مین داخل کرینگے جس کے
وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ،	نیچے نہرین بہتی ہونگی، خدا کی طرف سے اُن کو بدلہ ملیگا
(آل عمران-۲۰)	اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے،

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد،

ان آیات کی تفسیر وتشریح مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث مین مذکور ہے جسمین شہیدون کی فضیلتین، اوراُن کی اُخروی نعمتون کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ مین ہے، اسی شہادت اورغزا کے عقیدے نے مسلمانون مین مشکلات کے مقابلہ اوردشمنون سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کردی جسکی زندگی اورتازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعدبھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانون کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کردیتا ہے، اوراس حیاتِ جاوید کی تلاش مین ہرمسلمان بیتاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی، اور فرمایا کہ "مجھے آرزو ہے کہ مین خدا کی راہ مین مارا جاؤن، اوردوبارہ مجھے زندگی ملے، اورمین اسکو بھی قربان کردون، اورپھر تیسری زندگی ملے، اوراس کو بھی مین خدا کی راہ مین نثار کردون[1]" ذرا ان فقرون پر ایک بار اورنگاہ ڈال لیجئے، ان مین یہ نہین ہے کہ مین دوسرے کو مار ڈالون، بلکہ یہ ہے، کہ حق کے راستہ مین، مین مارا جاؤن، اورپھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤن، پھر زندگی ملے، اورپھر مارا جاؤن،

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد یہ تو وہ جہاد ہے جسکا موقع ہرمسلمان کو پیش نہین آتا اورجسکو آتا بھی ہے توعمر مین ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ مین دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہرمسلمان کو ہروقت پیش آسکتا ہے اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اُمتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علمِ دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبون کی مدد، زیردستون کی امداد، سیہ کارون کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، ردِ ظلم، اوراحکامِ الٰہی کی تعمیل مین ہمہ تن اورہروقت لگا رہے، یہانتک کہ اسکی زندگی کی ہرجنبش وسکون ایک جہاد بنجائے اوراسکی پوری زندگی جہاد کا ایک غیرمنقطع سلسلہ نظر آئے، سورۂ آل عمران کی جسمین جہاد کے مسلسل احکام مین آخری آیت ہے

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا اے ایمان والو! مشکلات مین ثابت قدم رہو اورمقابلہ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (آل عمران-۲۰) مین مضبوطی دکھاؤ، اورکام مین لگے رہو، اورخدا سے ڈرو، [illegible]

یہی وہ جہادِ محمدی ہے جو مسلمانون کی کامیابی کی کنجی اورفتح وفیروزی کا نشان ہے،

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد،

عبادات قلبی

یہ اسلام کے اُن عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہین، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان مین بھی ہے لیکن اسلام مین بعض ایسی عبادات بھی ہین، جنکا تعلق تمامتر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتون سے ہے، پہلے معلوم ہوچکا ہے، کہ اسلام مین ہر نیکی کا کام عبادت ہے، اس لئے تمام امورِ خیر خواہ وہ جسمانی، یا مالی، یا قلبی ہون عبادات کے اندر داخل ہین، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیہ نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضون تک محدود رکھا ہے، اور صوفیہ نے اُن سارے فریضون کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیشِ نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے، اور نہ تصوف کی، اسکا مقصود اُن فرائض کو بتانا ہے، جنکی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے، اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام مین انکی اہمیت کا پتہ چلتا ہے،

اس قسم کے چند فرائض جنکا مرتبہ عباداتِ پنجگانہ کے بعد قرآن پاک مین سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہین، یہ وہ فرائض ہین، جنکا تعلق انسان کے قلب سے ہے، اور اسی لئے ان کا نام "قلبی عبادات" رکھا جاسکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہین جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہین، جن کے الگ کر دینے سے وہ عباداتِ پنجگانہ بھی جنپر اسلام نے اسقدر زور دیا ہے، جسد بے روح بنجاتے ہین، یہ بات گو یہان بے محل ہے مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوّف کی ایک دوسرے سے علٰحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور

دوسری طرف اعمالِ تصوّف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے،

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر وشر کی تمیز کیلئے خلش ہو، یہ تقویٰ ہے، پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ اخلاص ہے، پھر اُس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ توکّل ہے، اُس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسب حال بر آمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے، اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ صبر ہے، اور اگر کامیابی کی نعمت ملے، تو اُس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے، اور جسم وجان و زبان سے اسکا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے، یہ شُکر ہے،

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے،

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے،

اگر محمد رسول اللہ صلعم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اسکو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی رُوح کو پیدا کرنا ہے، قرآنِ پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اسکی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں،

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ، (بقرہ - ۱) یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے،

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے،

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ ۳) اے لوگو اپنے اس پروردگار کی جسنے تم کو اور تمھارے پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تم تقویٰ پاؤ،

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے،

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ . (بقرہ - ۲۳)	تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگون پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقوی حاصل کرو،

حج کا منشا بھی یہی ہے،

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ، (حج - ۴)	اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلون کے تقوی سے ہے،

قربانی بھی اسی غرض سے ہے،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ، (حج - ۵)	خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہین پہنچتا، لیکن تمہارا تقوی اس کو پہنچتا ہے،

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لئے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقوی پر ہونی چاہیے،

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ (توبہ ۱۳)	جنے اپنی عمارت خدا سے تقوی پر کھڑی کی،
لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ، (توبہ ۱۳)	البتہ وہ مسجد جسکی بنیاد تقوی پر قائم کیگئی،

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ مین راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقوی ہے،

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ ۲۵)	اور سفر مین زاد راہ لیکر چلو، اور سب سے اچھا زاد راہ تقوی ہے

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھکر تقوی کا لباس ہے،

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ، (اعراف - ۳)	اور تقوی کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے،

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقوی کی بنیاد پر قائم ہے،

وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ، (بقرہ - ۳۱)	اور معاف کر دینا تقوی سے قریب تر ہے،
اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ، (مائدہ - ۲)	انصاف کرنا تقوی سے قریب تر ہے،

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ، (اٰل عمران - ۱۹) | اور اگر صبر کرو، اور تقویٰ کرو، تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے،

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ، (بقرہ - ۲۸) | اور تقویٰ کرو، اور لوگون کے درمیان صلح کراؤ،

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا، (نسا - ۱۹) | اور اگر اچھے کام کرو، اور تقویٰ کرو، تو اللہ تمھارے کامون سے خبردار ہے،

اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتون کے مستحق ہیں

آخرت کی ہر قسم کی نعمتین انھین تقویٰ والون کا حصہ ہے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ، (دخان) بے شبہہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ مین ہونگے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ، (طور - ۱) | بے شک تقویٰ والے باغون مین، اور نعمت مین ہونگے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ، (ذاریات - ۱) | شک نہین کہ تقویٰ والے باغون مین اور چشمون مین ہونگے

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ، (قمر - ۱) | بلاشبہہ تقویٰ والے باغون مین اور نہرون مین ہونگے

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ، (مرسلات - ۱) | بلاشک تقویٰ والے سایون مین اور چشمون مین ہونگے

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (ن - ۲) | یقیناً تقویٰ والون کے لئے اُنکے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہین

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا، (نباء - ۲) | بے شبہہ تقویٰ والون کے لئے کامیابی ہے،

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ، (ص - ۴) | لاریب تقویٰ والون کیلئے بازگشت کی اچھائی ہے،

کامیابی اہل تقویٰ کیلئے ہے،

گو بظاہر ابتدا مین اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتین اور بلائین پیش آئین، یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزون سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششون اور ناروا راستون سے پرہیز کرنا پڑے، اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ اُن کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہین، اور یہ خیال کرتے ہین کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمرون کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجون کا فیصلہ

کر لینا چاہئے، حالانکہ جو جتنا دوربین ہے، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہین بلکہ آخری نتیجہ پرنگاہ رکھتا ہے حقیقی دوربین اور عاقبت اندیش وہ ہین، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہین، بلکہ آخرت کے دائمی، اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہین، اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمرون پر رہتی ہے، تو دنیا بھی اُن کی بنجاتی ہے، اور یہان اور وہان دونون جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انھین کی قسمت ہین ہوتی ہے، فرمایا،

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ، (اعراف-۱۵) اور آخری انجام تقویٰ والون کے لئے ہے،

اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ، (ھود-۴) بے شبہہ انجام کار تقویٰ والون کیلئے ہے،

وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ، (زخرف-۳) اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والون کیلئے ہی

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ، (طٰہٰ-۸) اور انجام کار تقویٰ کے لئے ہے،

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہین | یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہین، جب وہ ہر کام مین خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہین، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہردلعزیزی کی صورت مین نہین چاہتے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندون مین بھی اُن کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہردلعزیزی پیدا ہوتی ہے،

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ، (انفال-۴) تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہین،

فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (آل عمران-۸) تو اللہ بے شک تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (توبہ-۱) اللہ بلاشبہہ تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ، (جاثیہ-۲) اور اللہ تقویٰ والون کا دوست ہے،

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہین | یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اسکی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہین، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دیسکتا ہے،

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ، (بقرہ ۲۴) اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے،

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ، (توبہ) اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقویٰ والوں کیساتھ ہے،

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے

ایک کام ہزاروں اغراض، اور سیکڑوں مقاصد کو سامنے رکھکر کیا جا سکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انھیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا،

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ، (مائدہ ۵) اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے،

اسی لئے انھیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے، اور آخرت میں بھی،

تقویٰ والے کون ہیں

یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت، اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے، اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لئے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے، جو سورۂ زمر میں ہے،

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اور جو سچائی لے کر آیا، اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ، لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ ہیں تقویٰ والے، ان کے لئے ان کے رب کے پاس

عِنْدَ رَبِّھِمْ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ، (زمر ۴) وہ ہے جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا،

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ، اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے، اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت، اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے، اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا،

لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورۂ بقرہ میں ہے،

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں

وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا، اور اپنا مال

عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَہْدِہِمْ اِذَا عٰہَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ (بقرہ-۲۲)

اس کی محبت پر رشتہ دارون، یتیمون، مسکینون، مسافر اور مانگنے والون کو اور گردنون کے آزاد کرانے مین دیا، اور نماز کو برپا کیا، اور زکوۃ ادا کی، اور جو وعدہ کرکے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہین، اور سختی، تکلیف، اور لڑائی مین صبر کرنے والے ہین، یہی وہ ہین، جو سچے ٹھہرے، اور یہی تقویٰ والے ہین،

ان آیتون مین تقویٰ والون کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایان کر دیا گیا، اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ مین سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہین،

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے، تقویٰ اصل مین وقویٰ ہے، عربی زبان مین اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے، اور لحاظ کرنے کے ہین، لیکن وحیِ محمدیؐ کی اصطلاح مین یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کرکے دل مین خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظون مین ہم یون کہہ سکتے ہین کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام مین خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اسکی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہو، یہ بات کہ تقویٰ اصل مین دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکانِ حج کے بیان کے موقع پر ہے،

وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ۔ (حج - ۴)

اور جو شعائرِ الٰہی کی تعظیم کرتا ہے، تو وہ دلون کے تقویٰ سے ہے،

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجاے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امورِ خیر کی طرف دلون مین تحریک پیدا، اور شعائرِ الٰہی کی تعظیم سے اُن کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیتِ کریمہ مین ارشاد ہے،

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ، (حجرات - ۱)

بیشک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، وہی ہیں، جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے، اُن کو معافی ہے اور بڑا بدلہ،

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے،

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ، (الشمس - ۱)

تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا،

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے، اور دونوں بندہ کو فطرةً ودیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہرحال یہ دونوں الہام ربانی ہیں، اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لئے یہی تقویٰ کا مقام ہے،

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے، اور اُن سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا، تو اللہ تعالےٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا،

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ، (فتح - ۴)

اور جب کفار نے اپنے دلوں میں پچ رکھی، نادانی کی پچ، تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا، اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا، اور وہی تھے اس کے لائق، اور اس کے اہل،

یہاں جنگ وخونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب، اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفاے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے،

فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، (توبہ-۱)
تو تم ان کے عہد کو اُن کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، (توبہ-۲)
تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہین، تم بھی اُن کے ساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والون کو پیار کرتا ہے،

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کامون کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے، اسطرح اچھے کامون کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے، اور اسکی قلبی کیفیت مین ترقی ہوتی ہے،

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ، (محمد-۲)
جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے اُنکی سوجھ اور بڑھائی اور اُن کو اُن کا تقویٰ عنایت کیا،

اس سے عیان ہے کہ "تقویٰ" ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے، اور جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُسکو ہدایت پر ہدایت، اور فطری تقویٰ پر، مزید دولت تقویٰ مرحمت ہوتی ہے،

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع مین ارشاد فرمایا،

اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا (مسلم)
تقویٰ یہان ہے،

اور یہ کہکر دل کی طرف اشارہ فرمایا جس سے بے شک وشبہہ یہ واضح ہوجاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیون کی محرک ہے، اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے، اور یہی سبب ہے، کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتون کا مقصد، اور تمام اخلاقی تعلیمون کا ماحصل قرار پایا،

اسلام میں برتری کا معیار اسلام مین تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے، کہ تعلیم محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، غرض نوعِ انسانی کے ان صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبون کو مٹا کر صرف ایک ہی

امتیازی معیار قائم کر دیا جس کا نام تقویٰ ہے، اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے، اور اسلئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بہ آوازِ بلند یہ اعلان کیا،

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لئے
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ،	بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم مین سے خدا کے نزدیک
(حجرات - ۲)	سب سے معزز وہ ہے، جو تم مین سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے

اس اعلان کو آنحضرت صلعم نے ان دو مختصر لفظون مین ادا فرمایا، الکرمُ التقوی یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کے لئے حجۃ الوداع کے اعلانِ عام مین پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہین، برتر وہ ہے، جس مین سب سے زیادہ تقویٰ ہے"،

اخلاص

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، (قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اسکی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلعم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے،

الا وانّ فی الجسد مضغۃً اذا صلحت صلح الجسد کلّہٗ واذا فسدت فسد الجسد کلّہٗ الا وھی القلب[1]،	ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے، اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہشیار رہو کہ وہ دل ہے،

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لئے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، جلبِ منفعت، طلبِ شہرت یا طلبِ معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے،

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ، اَلَا لِلّٰهِ	تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گذاری

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرء لدینہ، وصحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات،

الدِّيْنُ الْخَالِصُ ط (زمر-۱) گواہی کیلئے ہشیار کہ اللہ ہی کیلئے ہے خالص اطاعت گذاری

مقصود یہ ہے، کہ خدا کی اطاعت گذاری میں، خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا مٹی کی مورت، یا آسمان وزمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض وغایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا،

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (فرقان-۴) کیا تو نے اُس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے،

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری وباطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے،

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ، وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ، قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ، قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ط (زمر-۲)

کہدے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گذاری کو اللہ کے لئے خالص کر کے اسکی عبادت کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں، کہدے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہدے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گذاری کو اس کے لئے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جسکی عبادت چاہے کرو،

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے،

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، اطاعت گذاری کو خدا کے لئے خالص کر کے،

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بُت پرستی، اور خواہشِ نفسانی کو دخل نہ ہو، اور اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (لیل-۱) یعنی

خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو،

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ مین ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہین، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی مزد، اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہین،

وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ. (شعراء-۶-۷-۸-۹-۱۰)

اور مین اس پر کوئی مزدوری تم سے نہین چاہتا میری مزدوری تو اسی پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے،

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا،

يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مَالًا‌ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ، (هود-۳)

اے میری قوم! مین تم سے اس پر دولت کا خواہان نہین میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے،

خود ہمارے رسول صلعم کو یہ کہدینے کا فرمان ہوا، مین تم سے اپنے لئے کوئی مزد و اجرت نہین چاہتا، اگر چاہتا بھی ہون تو تمہارے ہی لئے،

قُلۡ مَا سَاَلۡتُكُمۡ مِّنۡ اَجۡرٍ فَهُوَ لَـكُمۡ‌ؕ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ‌ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ، (سبا-۶)

کہدے کہ مین نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لئے، میری اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر گواہ ہے،

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتون سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض، اور صرف خدا کیلئے ہے، دوسری جگہ فرمایا،

لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى‌ؕ، (شورىٰ-۳)

مین اس پر تم سے کوئی مزدوری نہین چاہتا، مگر قرابتدارون مین محبت رکھنا،

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششون سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے (منفعت) اس کے لئے وہ تم سے کسی ذاتی کا خواہان نہین، اگر وہ اس کے معاوضہ مین کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابتدارون کا حق ادا کرو، اور آپس مین محبت رکھو،

اسی قسم کی بات ایک اور آیت مین ظاہر کیگئی ہے،

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ	کہدے کہ مین تمھاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ
اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۔	نہین مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی
(فرقان-۵)	طرف راستہ پکڑے،

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم مین سے کچھ لوگ حق کو قبول کرلین،

دنیا مین بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہوجائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمایش تھا، تو اس کام کی قدر وقیمت فوراً نگاہون سے گرجائیگی، اسی طرح روحانی عالم مین بھی خدا کی نگاہ مین اس چیز کی کوئی قدر نہین جو اسکی بارگاہِ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لئے پیش کیگئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بےغرض و بے منت اور بلاخیال مزد و اجرت، اور تحسین وشہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین وشہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انھین کو ادا کرتی ہے جنکی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انھون نے اپنا کام انھین شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے،

ہم جو کام بھی کرتے ہین اسکی دو شکلین پیدا ہوتی ہین، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضا کی حرکت وجنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جسکا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادۂ ونیت، اور کام کی اندرونی غرض وغایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونون مین اسی روحانی پیکر کے حسن وقبح اور ضعف وقوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعوی کے ثبوت مین ہے، اسی لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام مین نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے، اور نہ اخلاق ومعاملات عبادت کا درجہ پاتے ہین، اسلئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض وغایت سے بالا، اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھین، توراۃ اور قرآن دونون مین ہابیل اور قابیل آدم کے دو بیٹون کا قصہ ہے، دونون نے خدا کے حضور مین اپنی اپنی پیداوار کی قربانیان پیش کین، خدانے اُن مین سے صرف ایک کی قربانی قبول کی، اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا،

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ، (مائدۃ-۵)　　خدا تو متقیون ہی سے قبول کرتا ہے،

متقی بھی وہی ہوتے ہین، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لئے کام کرتے ہین، انھین کا کام قبول ہوتا ہے، اور اُن کو دین و دنیا مین فوز و فلاح بخشا جاتا ہے ان کو خدا کے ہان محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے، اور دنیا مین اُن کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کامون کو شہرت نصیب ہوتی ہے، اور ان کے کارنامون کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتون اور قومون کے محسن ہوتے ہین، لوگ اُن کے ان کامون سے نسلاً بعد نسلٍ فیضیاب ہوتے ہین، اور اُن کے لئے رحمت کی دعائین مانگتے ہین حضرت موسیٰؑ کے عہد مین فرعونیون کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہین آتا تھا، کہ ان دونون سے انھون نے عجائب وغرائب امور کا یکسان مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونون کے عجائب وغرائب مین ظاہری نہین باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازیگری ہے، اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہو، اسی لئے یہ فیصلہ کر

وَلَا یُفْلِحُ السَّاحِرُ حَیْثُ اَتٰی (طٰہٰ-۳)　　اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہین پائیگا،

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگرون کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بنکر رہ گئے، اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتون تک دنیا مین قائم رہی،

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے، جو دل کے کارخانہ مین تیار ہوتا ہے، اسی لئے اس بات کی ضرورت ہو کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائیگا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیون ضروری قرار دیا ہے،

توکّل

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ، (آل عمران۔۱۷)

توکّل قرآن پاک کی اصطلاح کا اسم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہین، کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کیجاے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤن توڑے کسی حجرہ یا خانقاہ مین بیٹھ رہا جاے، اور یہ سمجھا جاے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کردیگا، یعنی تقدیر مین جو کچھ ہے وہ ہو رہیگا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہین، لیکن یہ سراسر وہم ہے، اور مذہبی اپاہجون کا دلخوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرّہ بھر بھی تعلق نہین،

توکّل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہین، اور اصطلاح مین خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہین، لیکن کس بات مین بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے مین یا نہ کرنے مین؟ جھوٹے صوفیون نے ترکِ عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسرون کے سہارے جینے کا نام توکّل رکھا ہے، حالانکہ توکّل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام مین بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اُسمین ضرور ہم کو کامیاب فرمائے گا،

اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش کا ترک ہی توکّل ہوتا، تو دنیا مین لوگون کے سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ پیغمبرون کو مبعوث نہ کرتا، اور نہ ان کو اپنی تبلیغِ رسالت کے لئے جدوجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا، اور نہ اس راہ مین جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و اُحد، اور خندق و حنین مین سوارون، تیراندازون، زرہ پوشون، اور تیغ آزماؤن کی ضرورت پڑتی، اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی،

توکّل مسلمانون کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگون سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو، اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کریگا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو، اور اس سے مایوس اور بودے نہ ہو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جد وجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تمپر فضل و کرم ہوا، اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آل عمران مین ہے،

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ، (آل عمران - ۱۷)	اور کام (یا لڑائی) مین اُن سے مشورہ لو، پھر جب پکّا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والون کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا، اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے، اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ رکھین،

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکّل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہین، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار رہے، تو کوئی ہم کو ناکام نہین کر سکتا، اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مدد کارآمد نہین ہو سکتی، اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام مین خدا پر بھروسہ رکھے،

منافق اسلام اور مسلمانون کے خلاف سازشین اور راتون کو جوڑ توڑ کرتے ہین، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالون کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کامون کو بنائے گا،

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔ (نساء-۱۱)

تو ان منافقوں سے در گذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا،

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے، تو مخالفوں کی کثرت، اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دیجاتی ہے، اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو،

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّىْ بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ الَّذِىْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِى السّٰجِدِيْنَ، (شعراء-۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر، اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لئے اپنی شفقت کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہنا نہ مانیں تو کہدے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں، اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھکو دیکھتا ہے جب تو (رات کو) اٹھتا ہے، اور نمازیوں میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے،

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت صلعم تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادتگذار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے، احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے، وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

اے پیغمبر خدا سے ڈر، اور کافروں اور منافقوں کا کہا نہ مان، بیشک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا،

(احزاب - ۱)

کیجاتی ہے اس کے پیچھے چل، بیشک خدا تمہارے کامون سے خبردار ہے، اور اللہ پر بھروسہ رکھ، اور اللہ کام بنانے کو کافی ہے،

کفار سے مسلسل لڑائیون کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکین تو تم بھی جھک جاؤ، اور مصالحت کرلو، اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہین دھوکا نہ دین، خدا پر بھروسہ رکھو تو اُن کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا،

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ،

(انفال - ۸)

اور اگر وہ صلح کے لئے جھکین، تو تو بھی جھک جا، اور خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہین تو کچھ پروا نہین کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے تجھکو اپنی اور مسلمانون کی نصرت سے تیری تائید کی،

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف وخطر ہوکر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانون کو حق کی تائید کے لئے کھڑے ہوجانے کا حکم ہوتا ہے،

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ،

(نمل - ۶)

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتین ظاہر کردیتا ہے جن مین وہ مختلف ہین، اور بیشک یہ قرآن مسلمانون کیلئے ہدایت اور رحمت ہے، بیشک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کردیگا، اور وہی غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے،

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی شکلون مین بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے، کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہین، اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہین، فرمایا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا، قُلْ
مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ
اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا، وَتَوَكَّلْ
عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ،
(فرقان - ٥)

اور مین نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری سنانے والا
اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہدے کہ مین تم سے
اس کے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہین مانگتا
کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے، اور اس
زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہین،

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہین،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيْمِ. (توبہ - ١٦)

تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانین، تو (ان سے) کہدو کہ مجھے
اللہ بس ہے، نہین کوئی معبود لیکن وہی، اسی پر مین نے
بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے،

آپس کے اختلافات مین اللہ کا فیصلہ چاہیئے، اس حالت مین بھی اُسی پر بھروسہ ہے،

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ
اُنِيْبُ، (شوریٰ - ٢)

اور جس چیز مین تم مین رائے کا اختلاف ہے، تو اوسکا
فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار اُسی
پر مین بھروسہ کرتا ہون، اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہون

رسول کو خدا کی آیتین پڑھکر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے، اور تسلی دیجاتی ہے کہ اُن کے کفر و نافرمانی کی پروا نہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو،

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ

ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم مین بھیجا ہے جس سے پہلے

مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ، (رعد-۴)

بہت سی قومیں گذر چکیں، تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے ماننے سے انکار کرتے ہیں، کہدے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے،

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے، اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد اُن کی شرارتوں سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہئے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہئے،

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ، (الملک-۲)

کہدے وہی رحم والا ہے، ہم اُس پر ایمان لائے، اور اسی پر بھروسہ کیا، تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے،

جس طرح ہمارے رسولؐ کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، مخالفتوں، اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولو العزم رسولوں کی زبانوں سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے، تو انھوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرمادیا،

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ، (یونس)

(اے پیغمبر!) ان کو نوح کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پر شاق گذرتا ہے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کر لیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب مضبوط کرلو پھر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اسکو مجھ پر پورا

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ دشمنون کے ہر قسم کے مکروفریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ مین استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکّل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہین، حضرت ہود علیہ السّلام کو اُن کی قوم جب اپنے دیوتاؤن کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب مین فرماتے ہین،

اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا
ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ، اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ
رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ ط (ھود - ۵)

مین اللہ کو گواہ کرتا ہون، اور تم بھی گواہ رہو کہ ان سے
بیزار ہون جنکو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر
تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کر لو، پھر مجھے مہلت نہ دو،
مین نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمھارا پروردگار ہے

حضرت شعیب علیہ السّلام اپنی قوم سے کہتے ہین کہ مجھے تمھاری مخالفتون کی پروا نہین، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کرونگا، میرا تکیہ خدا پر ہے،

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ
وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ
وَاِلَیْهِ اُنِیْبُ، (ھود - ۸)

مین تو جب تک مجھ مین طاقت ہے، کام سدھارنا
چاہتا ہون میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اُسی پر مین نے
بھروسہ کیا ہے، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہون،

ان پیغمبرون کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلعم کو تسلّی دیجاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کامون کے مشکلات مین اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے،

قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ
اِنَّا عٰمِلُوْنَ، وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ،
وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ
اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ
عَلَیْهِ ط (ھود - ۱۰)

کہدو اُن سے جو ایمان نہین لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو
ہم بھی کرتے ہین، اور تم بھی نتیجہ کا انتظار کرو، ہم بھی
کرتے ہیں، اور اللہ ہی کے قبضہ مین ہے آسمانون اور
زمین کا چھپا بھید، اور اسی کیطرف سارے کامون کا فیصلہ
لوٹایا جاتا ہے، پھر اُسکی عبادت کر، اور اس پر بھروسہ کر

مسلمانون کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور اُن کے پیرووں کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و قریب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے، اور خدا کی راہ مین کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی،

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ
وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا
مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ
وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ
لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ
مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا
وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ،
(ممتحنہ - ۱)

تمھارے لئے ابراہیم اور اُن کے ساتھیون مین پیروی
کا اچھا نمونہ ہے، جب انھون نے اپنی قوم سے کہا کہ
ہم تم سے اور خدا کے سوا جنکو تم پوجتے ہو اُن سے بیزار
ہین، ہم نے تمھارے مسلک کا انکار کر دیا، اور ہم مین
اور تم مین دشمنی اور نفرت ہمیشہ کیلئے کھل گئی، جبتک
تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ
سے یہ کہنا کہ مین تمھارے لئے خدا سے دعا کرونگا، اور
مجھے خدا کے کام مین کوئی اختیار نہین، اے ہمارے
پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا، اور تیری ہی طرف
ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس لوٹکر جانا ہے،

حضرت یعقوب علیہ السّلام اپنے عزیز بیٹون کو مصر بھیجتے ہین، لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہین کہ یوسف کی طرح اُن کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹون کو کہتے ہین، کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہین، بلکہ متفرق دروازون سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارسازِ حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیرون سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اسلئے بھروسہ تدبیر پر نہین، بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے،

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ
وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ
مَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِنِ الْحُكْمُ

اور (یعقوب نے) کہا، اے میرے بیٹو ایک دروازہ
سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازون سے جانا،
اور مین تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہین سکتا، فیصلہ

إِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ، (یوسف - ۸)

اسی کا ہے، اسی پر مین نے بھروسہ کیا، اور اسی پر چاہئے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کرین،

حضرت یعقوب علیہ السّلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ظاہری تدبیر شانِ توکّل کے منافی نہین،

حضرت شعیب علیہ السّلام کی دعوت کے جواب مین جب ان کی قوم اُن کو زبردستی بت پرست بنجانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب مین وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہین،

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَا أَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَا إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ، (اعراف - ۱۱)

اگر ہم پھر تمھارے مذہب مین آجائین جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا، اور یہ ہم سے نہین ہوسکتا کہ ہم پھر اُسین لوٹ کر جائین، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ مین تو حق کا فیصلہ کردے، اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والون مین سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور وقوت کے مقابلہ مین بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا،

يٰقَوْمِ إِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْا إِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ، (یونس - ۹)

اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لاچکے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو،

اُن کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کیساتھ جواب دیا،

عَلَى اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَۃً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ، (یونس - ۹) ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لئے آزمایش نہ بنا،

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا، اوران کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ اُن کے اسی توکّل کے صدقہ مین ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک مین اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرمادیا ہے،

مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَى اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ، (طلاق - ۱) جو خدا پر بھروسہ کریگا تو وہ اس کو کافی ہے،

یہ آیتِ پاک خانگی ومعاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں بیوی مین نباہ کسی طرح نہ ہوسکے، اور دونون مین قطعی علیحدگی (طلاق) ہوجائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہان سے کھائین گے؟ ع خدا خود میرِ سامان است اربابِ توکّل را،

توکّل کے متعلق قرآنِ پاک کی جس قدر آیتین ہین، وہ ایک ایک کرکے آپکے سامنے ہین، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالئے کہ اُن مین سے کوئی بھی ان معنون مین ہے جنمین ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہین، ان مین سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت، اور پرزور مخالفون کی تدبیرون سے نڈر ہوکر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام مین لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل مین یقین رکھین،

احادیث مین ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہوکر آنحضرت صلعم کی خدمت مین آیا، اور سوال کیا کہ یارسول اللہ مین اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکّل کرون، (کہ میرا اونٹ کھو کر جاتا رہے یا) یا اس کو باندھکر، ارشاد ہوا، اسکو باندھ کر خدا پر توکل کرو[۱]، اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع مین ادا کیا ہے،

ع بر توکّل زانوے اشتر بہ بند،

[۱] یہ حدیث بلفظ اعقلھا وتوکّل ترمذی (آخر ابواب القیامۃ ص۱۴) مین، اور قیّدھا وتوکل شعب الایمان بیہقی مین، اور قیّدھا وتوکّل خطیب کی رواۃ مالک اور ابن عساکر مین ہے (کنز العمال جلد ۲ ص۲۳ حیدر آباد)،

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں، تاہم حقیقت کے رو سے اس کا مفہوم قرآنِ پاک کے عین منشا کے مطابق ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی[1] جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں، کہ مادی اسباب و تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکّل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے لیکن آنحضرت صلعم نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی، اور فرمایا کہ "خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنّت میں داخل کر دیئے جائینگے، یہ وہ ہونگے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بد شگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکّل اور اعتماد رکھتے ہیں[2]۔" ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ "جو دغوانا اور تعویذ گنڈا کراتا ہے، وہ توکّل سے محروم ہے[3]۔" اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں، اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں[4]۔" اس حدیث سے بھی مقصود ترکِ عمل اور ترکِ تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو اُن کے گھونسلوں میں بٹھا کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ اُنکو بھی اُڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لئے دلتنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اس کے حصول کے لئے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ انھیں اگر یہ یقین ہو کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا، (ھود - ۱)	زمین میں کوئی رینگنے والا نہیں لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے،

تو وہ اس کے لئے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی، اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے، اور نہ اُن کو دلتنگی ور

---

[1] شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالی سے دعائیں ہیں، اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے، لیکن آیات اور دعاؤں کا لکھکر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں، [2] صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق، و کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے، [3] جامع ترمذی باب ما جاء فی کراہیۃ الرقی، اصل الفاظ یہ ہیں، من اکتوی او استرقی فقد بری من التوکل، [4] جامع ترمذی ابواب الزہد ص ۳۸۵ وحاکم،

مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثون کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت مین ادا ہوا ہے،

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ
مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ
قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا،
(طلاق-۱)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لئے مشکل سے نکلنے کا راستہ کردیگا، اور اس کو وہان سے روزی دیگا جہان سے اُسکو گمان نہ ہوگا، اور جو اللہ پر بھروسہ کریگا تو وہ اس کو بس ہے، بیشک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچکر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کردیا ہے

اوپر کی تفصیلون سے ہویدا ہے کہ توکّل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آجکل کے اخلاقیات مین "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہین جنمین یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہین، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے "خدا اعتمادی" کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطرون سے محفوظ ہے،

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف ۴)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ اُن کے نزدیک بےبسی و بیکسی کی تصویر ہے، اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی، "صبر کے لغوی معنی "روکنے" اور "سہارنے" کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اسکو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا، اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضرؑ کہتے ہیں:

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ۔ (کہف - ۹)

تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے، اور کیسے اُس بات پر صبر کر سکتے ہو جسکا علم تمہیں نہیں،

حضرت موسیٰؑ جواب میں فرماتے ہیں،

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا ۔ (کہف - ۹)

اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے،

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بےچینی کا پیدا نہ ہونا ہے،

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھانے بجھانے کے باوجود، پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم

رہتے ہین، تو اسکی حکایت اُن کی زبان سے قرآن یون کرتا ہے،

اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِھَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْھَا، (فرقان - ۴)
یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤن (بتوں) سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم اُن پر صابر (ثابت) نہ رہتے،

یعنی اگر ہم اپنے مذہب پر مضبوط اور ثابت قدم نہ رہتے، یہی مفہوم ایک اور آیت مین ہے، کفار آپس مین کہتے ہین

اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ (ص - ۱) کہ چلو اور اپنے خداؤن پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کیساتھ قائم رہو)

عرب گنوار انحضرت صلعم کے حجرہ کے سامنے آکر بدتمیزی سے آپ کو پکارتے تھے، ان سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی، ذرا ٹھہر جاتے،

وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ، (حجرات - ۱)
اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہانتک کہ تم (اے رسول) نکل کر اُنکے پاس آتے تو اُن کے لئے بہتر ہوتا،

قرآن پاک مین صبر کا لفظ اسی ایک معنی مین مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیّر سے اس کے مفہوم مین کہین کہین ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، با این ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جنمین قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہین،

وقت مناسب کا انتظار کرنا،

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، انحضرت صلعم نے جب شروع مین لوگون کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت مین سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے، اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتین اور رکاوٹین پیش کی جانے لگین، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا، اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی، اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا، کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہین، آپ مستعدی سے اپنے کام مین لگے رہین، خدا آپ کا نگہبان ہے،

خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئیگا، فرمایا،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا، (طور-۲) — (اے رسول) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے،

فَاصْبِرُوا حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا، (اعراف-۱۱) — تو ثابت قدم رہکر منتظر رہو، یہانتک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کردے

وَاصْبِرْ حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ (یونس-۱۱) — اور ثابت قدم رہکر منتظر رہ، یہانتک کہ خدا فیصلہ کردے وہ سب فیصلہ کرنے والون مین بہتر ہے،

فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (هود-۴) — ثابت قدم رہکر وقت کا منتظر رہ، بے شبہہ آخر کار کامیابی پرہیزگارون ہی کی ہے،

اس انتظار کی کشمکش کی حالت مین جب ایک طرف حق کی بیکسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤن کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش، اور ہنگامی غلبہ دلون کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہکر اس کی کامیابی کی پوری توقع رکھنی چاہئے،

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ، (روم-۶ مومن-۶و۸) ثابت قدمی کیساتھ منتظر رہ، بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے،

ایسا نہ ہو کہ وعدۂ الٰہی کے ظہور مین اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو، اور باطل کے گروہ مین ملجاؤ،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا، (دهر-۲) — اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ، اور ان (مخالفین مین) سے کسی گنہگار یا کافر کا کہنا نہ مان نے،

آنحضرت صلعم کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ اُن کو خیال ہوا کہ اُن کی نافرمان قوم پر عذاب آنے مین تاخیر ہو رہی ہے، اس لئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل مین مسلمان ہو چکی تھی، اسلئے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا، کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا سر رشتہ چھوٹنے نہ پائے،

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ — اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ

كَصَاحِبِ الْحُوْتِ، (ن-۲) انتظار کر، اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو،

بیقرار نہ ہونا، صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بیقراری نہ ہو، بلکہ اُن کو خدا کا حکم، اور مصلحت سمجھکر خوشی خوشی جھیلا جائے، اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئیگا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود انکو دور فرما دیگا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی،

وَالصَّابِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ، (حج-۵) اور جو مصیبت میں صبر کریں،

حضرت یعقوب علیہ السّلام بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سنکر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو کھا لیا، فرماتے ہیں؛

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ، وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ (یوسف-۲) بلکہ تمھارے دلوں نے ایک بات گھڑلی ہے، تو بہتر صبر ہے، اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو،

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لئے جانے کا حال سُنکر کہتے ہیں،

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا، (یوسف-۱۰) بلکہ تمھارے دلوں نے گھڑ لیا ہے، تو بہتر صبر ہے عنقریب خدا اُن سب کو ساتھ لائیگا،

حضرت ایوب علیہ السّلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اسکی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی،

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ (ص-۴) ہم نے بیشک ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا تھا،

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھکر فرماتے ہیں،

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ، (صافات-۳) اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کر گذر، خدا نے چاہا تو تو مجھے صابروں میں سے پائیگا،

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے، کہ منزلِ مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں، اور مخالفین جو طعن و طنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے، اور ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بجائے، اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے، مگر انھوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ اُن کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت صلعم کو اسی لئے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا،

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ . . . . . — اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر . . . .

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (مدثر-۱) — اور اپنے پروردگار کے لئے پامردی (صبر) کر،

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السّلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا،

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ — (اے محمدؐ!) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے

وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (احقاف-۴) — پیغمبروں نے کی، اور ان (مخالفوں) کے لئے جلدی نہ کر،

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کر،

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ — نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ — اس کو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے،

عَزْمِ الْأُمُورِ (لقمان-۲)

کفار عذابِ الٰہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بیکسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت صلعم کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروا نہ کر، اور نہ اُن سے دل کو اداس کر، بلکہ اپنے دھن میں لگا رہ، اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا،

اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ (ص) — اُنکے کہے پر صبر کر اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر،

اس قوتِ صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے، اور اسکی طاقت پر بھروسہ کیا جائے،

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ الآیہ (طٰہٰ-۸ ورق-۳)
تو اُن کے کہے پر صبر کر، اور صبح شام اپنے پروردگار کی حمد کر،

نہ صرف یہ کہ مخالفون کے اس طعن وطنز کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب مین اُن سے لطف ومروت برتا جائے فرمایا،

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا۔ (مزمل-۱)
اُن کے کہے پر صبر کر، اور اُن سے خوبصورتی سے الگ ہو جا،

درگذر کرنا | صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والون کی برائی کو نظر انداز، اور جو بدخواہی سے پیش آئے، اور تکلیفین دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل، اور برداشت مین اخلاقی پامردی دکھائی جائے قرآن پاک کی کئی آیتون مین صبر اس مفہوم مین استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ، وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَلَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْكُرُوْنَ (نحل-۱۶)
اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والون کے لئے یہ بہتر ہے، اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہین لیکن خدا کی مدد سے، اور اُن کا غم نہ کر، اور نہ انکی سازشون سے دلتنگ ہو،

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے مسلمانون کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لئے ہو،

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ
اور جنھون نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر

وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ (رعد-۳)

کیا، اور نماز کھڑی کی، اور جو ہم نے اُن کو روزی دی اس مین سے چھپے اور علانیہ (راہِ خدا مین) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہین، ان کے لئے آخرت کا گھر ہے،

فرشتے اُن کو مبارکباد دینگے اور کہین گے،

سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ، (رعد-۳)

تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا،

ایک خاص بات اس آیت مین خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع مین چند نیکیون کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی مگر فرشتون نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہی، کیونکہ یہی اصل ہے، جس مین یہ جوہر ہوگا وہ عبادات کی تکلیف بھی اُٹھائیگا مصیبتون کو بھی جھیلے گا، اور دشمنون کی بدی کا جواب نیکی سے بھی دیگا، چنانچہ ایک اور آیت مین اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے، کہ درگذر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس مین ہو گی جس مین صبر ہوگا،

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ، (فصلت-۵)

بھلائی اور برائی برابر نہین، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمھارے درمیان دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائیگا، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہین، اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے،

جو لوگون پر ظلم کرتے پھرتے ہین، اور ملک مین ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہین، اُنپر خدا کا عذاب ہوگا اس لئے ایک صاحبِ عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کرین تو بہادری سے اس کو برداشت کرے، اور معاف کر دے، فرمایا،

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ — راستہ انھین پر ہے جو لوگون پر ظلم کرتے ہین، اور ملک
وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ — مین ناحق فساد کرتے ہین، یہی ہین جن کے لئے پردرد
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ — عذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت کیا، اور بخش
إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ، (شوریٰ-۴) — دیا، بیشک یہ بڑی ہمت کا کام ہے،

ثابت قدمی صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت مین میدان جنگ مین بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم مین بارہا استعمال کیا ہے، اور ایسے لوگون کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے، کہ انھون نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا،

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَ — اور صبر کرنے والے (ثابت قدمی دکھانے والے) مصیبت
حِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا — مین اور نقصان مین اور لڑائی کے وقت، وہی ہین
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ، (بقرہ-۲۲) — جو سچ بولے اور وہی پرہیزگار ہین،

اگر لڑائی آپڑے تو اس مین کامیابی کی چار شرطین ہین، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت، آپس مین اتحاد وموافقت، اور میدان جنگ مین بہادرانہ صبر واستقامت،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً — اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو، تو
فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ — ثابت قدم رہو، اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا — پاؤ، اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو،
فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا — اور آپس مین جھگڑو نہین، ورنہ تم سست ہوجاؤ گے
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ، — اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر دکھاؤ، بیشک
(انفال-۶) — اللہ صبر کرنے والون کے ساتھ ہے،

حق کے مددگارون کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر وثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ

کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہین کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادرون نے فوج کی فوج کو شکست دیدی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثارون کو سکھا دیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنون کی بڑی تھی،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ
إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا
مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ
الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ، اَلْآنَ
خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا
فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ
وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ،

(انفال-۹)

اے پیغمبر! ایمان والون کو (دشمنون کی) لڑائی پر ابھار
اگر بیس صبر والے (ثابت قدم) ہون تو دو سو پر غالب
ہونگے، اور اگر سو ہون تو کافرون مین سے ہزار پر غالب
ہونگے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہین، اب اللہ نے تم سے
تخفیف کردی، اور اس کو معلوم ہے کہ تم مین کمزوری
ہے، تو اگر سو صبر والے (ثابت قدم) ہون تو دو سو
پر غالب ہونگے، اور اگر ہزار (صبر والے) ہون تو دو ہزار
پر خدا کے حکم سے غالب ہونگے، اور اللہ صبر کرنے والون
(ثابت قدمون) کے ساتھ ہے،

میدان کارزار مین مسلمانون کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعداد کی قلت کی پروا نہ کرین، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرین، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالی کی مدد انھین لوگون کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہین، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ مین بھی اسی نکتہ کو ان لفظون مین ادا کیا گیا ہے،

قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ
قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ
فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ
وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ، وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ
وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

طالوت کے ساتھیون نے کہا کہ آج ہم مین جالوت
اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہین انھون نے
جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات
تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد
کے لوگون پر غالب آگئے ہین، اور خدا صبر و ثبات

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ، — دکھانے والون کے ساتھ ہے، اور جب یہ جالوت اور اسکی فوج کے مقابلہ مین آئے، تو بولے اے ہمارے پروردگار ہمپر صبر بہا، اور ہم کو ثابت قدمی بخش، اور ان کافرون کے مقابلہ مین ہم کو نصرت عطا کر،

(بقرہ - ۳۳)

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانون کی کامیابی کی بھی یہی تسرط رکھی ہے، اور بتا دیا ہے کہ خدا انھین کا ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہین، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہین،

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جَاهَدُوْا وَصَبَرُوْا ، — پھر تیرا پروردگار اُن کے لئے ہے جنھون نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے، اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے،

(نحل - ۱۴)

دنیا کی سلطنت وحکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰؑ نے انکو پہلا سبق یہ سکھایا،

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ، — موسیٰ نے اپنے لوگون سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر و استقامت سے کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندون مین سے اس کا مالک بناتا ہے، اور انجام پرہیزگارون کے لئے ہے،

(اعراف، ۱۵)

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قومون سے تعداد مین بہت کم تھے لیکن جب انھون نے ہمت دکھائی، اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو اُن کی ساری مشکلین حل ہو گئین، اور کثیر التعداد دشمنون کے نرغہ مین پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قومون پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ

صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا،

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا کَانَ یَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا کَانُوْا یَعْرِشُوْنَ (اعراف - ۱۶)

اور اُن لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کی وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں اُن کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کردیا،

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لئے سربلند ہوئی کہ اُنہنے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی،

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَکَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ، (سجدہ - ۳)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انھوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے،

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین، اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثبات قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا شدت یقین، اور پھر اُن اصول کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا،

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی، بلکہ ستر مسلمان خاک و خون میں لتھڑ کر راہ خدا میں جانیں دیتے ہیں، بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لئے

پچھلے پیغمبرون کی زندگی کی روداد اُن کو سناتا ہے،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ	اور کتنے پیغمبر ہین جن کے ساتھ ہوکر بہت سے خدا
كَثِيْرٌ، فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	کے طالب لڑے ہین، پھر خدا کی راہ مین تکلیف اٹھا کر
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ	انھون نے ہمت نہین ہاری، اور نہ اُنکے دل ٹوٹے
الصّٰبِرِيْنَ، وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ	ہوئے، اور اللہ ثابت رہنے والون (صابرین) کو دوست
قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا	رکھتا ہے، اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے
فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا	پروردگار ہمارے گناہون کو اور کام مین ہماری
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ،	زیادتی کو معاف کر، اور ہمارے قدم ثابت رکھ،
(آل عمران - ۱۵)	اور کافرون کے مقابلہ مین ہماری مدد فرما،

اس آیتِ پاک نے غلط فہمیون کے اُن تو بر تو پردون کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہین، اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بیکسی کے مجبورانہ درگذر کا نہین، بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر مین نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثون کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے، اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے، اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے دشمنون پر کامیابی بخشے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانون کو دو باتون کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا،

دنیا کی فتحیابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے انھین کے حصہ مین ہے، جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی، اور حق پر ثباتِ قدم کی دولت ملی، حق کی راہ مین مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اُن

کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے، اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا،

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران - ۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے، اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں،

ضبطِ نفس اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا، اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے، مگر یہی ضبطِ نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے، اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار، اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے،

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو، اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے، انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہے،

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ، وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ، اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ، (هود - ۲)

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں، تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں، بیشک وہ شادان اور نازان ہے لیکن وہ جنھوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کئے یہ لوگ ہیں جن کے لئے معافی (اور بڑا اجر ہے)

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر ٹھہر جانا مردی سے ایک معنی کر بڑھ کر دہ

صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے مین ظاہر ہوتا ہے اسی لئے مذہبی فرائض واحکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گذرتے ہین، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال، اور ہر کام مین خدا کے حکم کی فرمانبرداری، اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لئے حکم ہوا،

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ، (مریم-۴)

آسمانون کا پروردگار، اور زمین کا، اور جو ان دونون کے بیچ مین ہے سب کا، تو اس کی بندگی کر، اور اسکی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت مین نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل وعیال پر بھی اسکی تاکید رکھنے کے سلسلہ مین ہے،

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْهَا (طہ-۸)

اور اپنے گھر والون کو نماز کا حکم کر، اور آپ اس پر قائم رہ،

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے،

حسب ذیل آیتون مین غالباً صبر اسی مفہوم مین ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے اللہ تعالیٰ اُن کو خوشخبری سناتا ہے،

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْیَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا، وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِیْرًا، (دھر-۱)

تو اللہ نے اُن کو اس دن کی برائی سے بچا لیا اور اُن کو ترو تازگی وشادمانی سے ملایا، اور اُن کے صبر کرنے (یعنی احکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ مین دیا،

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ مین توبہ کرین، ایمان لائین، نیک کام کرین، فریب کے کامون مین شریک نہ ہون بیہودہ اور لغو کامون کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائین، اور خدا کی باتون کو سنکر اطاعت مندی سے اس کو قبول کرین اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائین مانگین، انکے

لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کی یہ بشارت سناتا ہے،

أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا (فرقان-۶) ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ مین ملیگا کہ وہ صبر کرتے رہے

ان دونون آیتون مین صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کامون کو باوجود خلافِ طبع اور تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے، اور بری باتون سے باوجود اس کے کہ ان مین ظاہری خوشی اور آرام ہے بچتے رہے، راتون کو نرم بسترون سے اٹھکر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہوکر دوگانہ ادا کرنا، الوانِ نعمت کی لذتون سے محروم ہوکر روزے رکھنا، تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعون پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ مین شدائد کو آرام وراحت جان کر جھیل لینا، سود کی دولت سے ہاتھ اٹھالینا، حسن وجمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجاآوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے، اور اسی لئے ایسے صابرون کی جزا بھی خدا کے ہان بھاری ہے

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح مین وہ حدیث یاد آتی ہے، جسمین آنحضرت صلعم نے فرمایا،

حُجِبت (حُفّتِ) الجنّة بالمكاره وحُجِبت (حُفّتِ) النّارُ بِالشّهواتِ (صحیح بخاری کتاب الرقاق وصحیح مسلم، کتاب الجنة) جنت ناخوشی کے کامون، اور دوزخ نفسانی لذتون کے کامون سے ڈھانپی گئی ہے،

یعنی نیکی کے ان کامون کا کرنا جنکا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا مین نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہون کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا مین بڑے پرلطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہین، اس عارضی وہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانۂ مال ودولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر، اگر کسی کے منھ مین پانی نہ بھر آئے اور اس وقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے مالِ حلال کی قلت کو صبر کرکے خوشی کے ساتھ برداشت کرلے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابرون کو ملی ہے،

حضرت موسیٰ کے زمانہ مین جو قارون تھا اس کے مال و دولت کو دیکھکر بہت سے ظاہر پرست لالچ مین پڑ گئے، لیکن جنھین صبر و برداشت کا جوہر تھا اُن کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی، اور اُن کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو نکوکارون کو بہشت مین ملیگی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے،

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ، (قصص - ٨)

جو لوگ حیاتِ دنیاوی کی آرایش کے خواہان تھے وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے، اور جنھین علم ملا تھا انھون نے کہا، تمھارا برا ہے، اللہ کی جزا ان کے لئے جو ایمان لایا اور نیک کام کئے سب سے اچھی چیز ہے، اور اس حقیقت کو وہی پاسکتے ہین جو صابر ہین،

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہو گی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملیگی جو لازوال اور باقی ہے،

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ، وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، (نحل - ١٣)

جو تمھارے پاس ہے وہ چک جائیگا، اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہجانے والا ہے، اور یقیناً ہم اُن کو جنھون نے صبر کیا ان کی مزدوری اُن کے بہتر کامون

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازین ادا کیا کرو، کہ نیکیان بدیون کو دھو دیتی ہین، اس پیغام مین نصیحت قبول کرنے والون کے لئے نصیحت اور یاددہانی ہے، اسکے بعد ہے،

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ، (هود - ١٠)

اور صبر کر، کہ بے شبہہ اللہ نیک کام کرنے والون کی مزدوری ضائع نہین کرتا،

صبر کے فضائل اور انعامات

یہ مزدوری کیا ہو گی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہو گی۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ، (زمر - ٢)

صبر کرنے والون کو تو انکی مزدوری بے حساب ملیگی،

جن محاسن اور محامدِ صفات، اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، اُن میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے،

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا،

(احزاب — ۵)

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں، اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں، اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا کے سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے اُن کیلئے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اُسکے معاوضہ میں ملتی ہے، یہی بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے،

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ،

(جنت اور خدا کی خوشنودی اُنکو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لاچکے، ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور

سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا
کی راہ مین) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتون کو خدا سے (آل عمران - ۲)
اپنے گناہون کی معافی مانگنے والے ،

اس آیت مین ایک عجیب نکتہ ہے ، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے ، اور ان دونون کے بیچ مین اُن کے چار اوصاف گنائے ہین جنمین پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے تکلیف جھیلنے ، اور پامردی دکھانے کا ہے ، دوسرا راستی اور راست بازی کا تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا ، اور چوتھا راہ خدا مین خرچ کرنے کا ،

فتح مشکلات کی کنجی: صبر اور دعا

بعض آیتون مین ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظون مین سمیٹ لیا گیا ہی ، دعا ، اور صبر ، اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزین مشکلات کے طلسم کی کنجی ہین ، یہود جو آنحضرت صلعم کے پیغام کو قبول نہین کرتے تھے ، اس کے دو سبب تھے ، ایک یہ کہ اُن کے دلون مین گداز اور تاثر نہین رہا تھا ، اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ اُن کو جو جانی و مالی دشواریان پیش آتین ، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر اُن کو برداشت نہین کر سکتے تھے ، اسی لئے محمد رسول اللہ صلعم کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا ،

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ، (بقرہ - ۵) اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو ،

دعا سے اُن کے دل مین اثر اور طبیعت مین گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلین دور ہونگی ، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانون کے برخلاف تلوارین اٹھائین ، اور مسلمانون کے ایمان کیلئے اخلاص کی ترازو مین تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتین نازل ہوئین ،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ	اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت
وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ، وَلَا	پکڑو ، بیشک اللہ صبر والون (ثابت قدم رہنے والون)
تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ	کے ساتھ ہے ، اور جو خدا کی راہ مین مارے جاتے ہین

بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ

(بقرہ - ۱۹)

ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو خبر نہیں اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ، اور بھوک، اور مال وجان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائینگے، اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوشخبری سنادو، جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں، اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے یہ لوگ ہیں، اُن پر اُن کے پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں، اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر،

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہئے، جان ومال کی جو مصیبت پیش آئے اُس کو صبر، ضبطِ نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کریں، اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں، آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی، اس لئے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہئے، اگر اس راہ میں موت بھی آجائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے،

شُکر

وَکُنْ مِّنَ الشّٰاکِرِیْنَ، (اعراف - ۱۷)

لُغت مین شکر کے اصلی معنی یہ ہین کہ "جانور مین تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو، اور دودھ زیادہ دے" اس سے انسانون کے محاورہ مین یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدرشناسی تین طریقون سے ہوسکتی ہے، دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤن سے، یعنی دل مین اس کی قدرشناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اُس کے کامون کا اقرار ہو، اور ہاتھ پانون سے اُس کے ان کامون کے جواب مین ایسے افعال صادر ہون جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کرین،

شکر کی نسبت جس طرح بندون کی طرف کیجاتی ہے، خدا نے قرآن پاک مین اپنی طرف بھی کی ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندون کے ذرا ذرا سے نیک کامون کی پوری قدر کرتا ہے، اور ان کو اُن کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے،

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہین، اور محاورہ مین کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اُسکے اقرار اور عمل سے اُس کے اظہار نہ کرنے کے ہین، اسی سے ہماری زبان مین "کفرانِ نعمت" کا لفظ استعمال مین ہے،

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کے لغت مین نہین، اللہ پاک کے احسانون اور

نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے اُن کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا، کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے،

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ مین بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک مین یہ دونون لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہین،

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۔ (دھر-۱)

ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا، (اب وہ) یا شکرگذار (شاکر) ہے، یا ناشکرا (کافر)

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۔ (ابراہیم-۲)

اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمھین بڑھائینگے، اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بیشک میرا عذاب بہت سخت ہے،

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانون اور نعمتون کی ناقدری کرکے اس کی نافرمانی کا نام ہے، تو اس کے مقابلہ مین شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتون کی قدر جان کر اسکے احکام کی اطاعت، اور دل سے فرمانبرداری کیجائے، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے،

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (نحل-۱۶)

دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اسکو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والون مین سے نہ تھا، اللہ کے احسانون اور نعمتون کا شکرگذار اللہ نے اسکو چن لیا، اور اس کو سیدھی راہ دکھائی،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتون اور احسانون کی شکرگذاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کیجائے احکام الٰہی کی پیروی کیجائے، اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائیگا اور ہر علم و عمل مین ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا،

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعت الٰہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی

بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہیئے، اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا، (نساء-۲۱) اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دیکر کیا کریگا، اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہی،

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے، اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کیساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولتمند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہی، صاحب علم اپنے علم سے بندگانِ الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہی تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہونگے، تو یہ کہا،

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ، (اعراف-۲) تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائیگا،

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا،

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِيْنَ، (آل عمران-۱۵) اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دینگے،

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے،

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشَّاكِرِيْنَ (زمر-۶) بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گذاروں میں سے ہو،

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اُس کا بدلہ دیکر اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے، اور یہی سبب ہے کہ حمد الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے اُن صفات کاملہ کا ذکر ہوتا ہی، جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں، اور اسی لئے یہ کہنا چاہیئے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ

ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے، اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، (فاتحہ-۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے،

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں، سب کی پرورش، اور زندگی اور بقا اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں، اور نکھر رہے ہیں، اس لئے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازلِ حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی، اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکیگا، یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہلِ جنت جنت میں اور اہلِ دوزخ دوزخ میں جا چکینگے، وہ وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی جس کے لئے خدا نے اس کو بنایا تھا، اس وقت عالم امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی،

وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، (زمر-۸) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے،

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے،

لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (روم-۲) اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے،

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں،

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ، (مومن-۱) جو عرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اس کے چاروں طرف ہیں وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں،

بلکہ عرصۂ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے،

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، (بنی اسرائیل-۵) اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو،

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانون سے ہے،

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (حجر، طٰہٰ، مومن، طور، فرقان) اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر،

آنحضرت صلعم کے سنن اور شمائل مین ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائین ہین، مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سوکر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد مین جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی، وغیرہ وغیرہ ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتون کی حمد اور زبان سے اُسکا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہئے،

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتین عنایت فرمائی ہین اُن کا شکریہ یہ ہے، کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤن کو خدا کے حکمون کی تعمیل مین لگا رکھین، اور اُن سے اُن کی خدمت کرین جو اس جسمانی نعمت کے کسی جزء سے محروم ہین، مثلاً جو اپاہج اور معذور ہون، بیمار ہون، کسی جسمانی قوت سے محروم ہون، یا کسی عضو سے بیکار ہون، مالی نعمتون کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہون، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکون کو کھانا کھلایا جائے پیاسون کو پانی پلایا جائے، ننگون کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایون کو سرمایہ دیا جائے،

قرآن پاک کی مختلف آیتون مین مختلف نعمتون کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لئے ہر آیت مین اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے،

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ	بڑی برکت اسکی ہے جس نے آسمان مین برج بنائے
جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا، وَهُوَ الَّذِیْ	اور اس مین ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا
جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ	اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک
یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا، (فرقان-۶)	آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے

اس مین اپنی قدرت کی نعمتون کا ذکر کرکے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کرین، اور دن کی روشنی اور چاند کے اُجالے اور رات کے سکون مین ہم وہ فرض ادا کرین

جس کے لئے یہ چیزین ہم کو بنا کر دی گئی ہین، دوسری آیتون مین ہے،

...... الرَّحِيمُ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ، ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ۔ (سجدہ-۱)

بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی، اور انسان کی پیدایش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر سے نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر اس کو درست کیا، اور اس مین اپنی روح سے کچھ پھونکا، اور تمھارے کان، اور آنکھین اور دل بنائے تم کم شکر کرتے ہو،

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (نحل)

اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤن کے پیٹون سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے، اور تمھارے لئے کان اور آنکھین اور دل بنائے،

ان آیتون مین خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان، اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت وکبریائی اور یکتائی کو تسلیم کرین، اور یہ سمجھین کہ جسنے یہ زندگی دی، اور اس زندگی مین ہم کو یون بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے، اور اس مین بھی ہم کو بہ کچھ عنایت کر سکتا ہے، اور پھر ہاتھ پاؤن سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کرین بعض اور آیتون مین ہے،

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (حج-۵)

تو ان جانورون کے گوشت مین سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بیقرار ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمھارے قابو مین دیئے ہین، تاکہ تم شکر کرو،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ، (بقرہ-۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں مین سے کھاؤ اور خدا کا شکر کرو،

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ، (نحل-۱۵)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزین روزی کین انکو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اُسی کو پوجتے ہو،

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اسکا شکریہ بھی خدا کو مانکر مال کے ذریعہ ادا کرین،

دنیا مین شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کرین، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہین کیا جا سکتا اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندون کے ساتھ کرین، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظون مین ادا فرمایا ہے،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ، (قصص-۸) اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر،

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہین، کہ اُسکو کوئی قرضہ دے، خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورتمند بندون کو یا قابل ضرورت کامون مین روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے،

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے،

(بقرہ-۳۲-وحدید-۲)

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، (حدید-۲ ومزمل-۲) اور خدا کو قرض حسنہ دو،

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، (تغابن-۲) اگر خدا کو قرض حسنہ دوگے،

خدا کو قرضِ حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اسکی روشنی مین اس حدیث کو پڑھنا چاہئے،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائیگا،

اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہیگا، اے میرے پروردگار، تو تو جہان کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا۔ فرمائیگا، کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلان بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پرسش نہ کی، اور اگر کرتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائیگا اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہین کھلایا، بندہ عرض کریگا اے میرے پروردگار، تو تو سارے جہان کا رب ہے، مین تجھے کیسے کھلاتا، فرمائیگا، تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلان بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہین کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! مین نے تجھسے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہین پلایا، بندہ کہے گا، اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے مین تجھے کیسے پانی پلاتا، فرمائیگا میرے فلان بندہ نے تجھسے پانی مانگا، تو نے اس کو نہین پلایا، اگر تو اس کو پلاتا، تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا"

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتون کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہیئے،

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتون کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لئے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگین کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتون کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے، حالانکہ اُن کے لئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا، نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی جوکچھ ملا اُسکے فضل و کرم سے ملا، اور جو کچھ ملیگا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی، انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششون کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہین، دیکھکر، اور اُن کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہین، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہین، مگر خوب سمجھنا چاہیئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلین نکلتی ہین اسی لئے

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض،

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک مین اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے، اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیتِ الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بارآور بنائے،

دولت ونعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانون سے کوئی بلند تر ہے، اور جو اُس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا، یا اس کے یہ ذاتی علم وہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قارون نے کہا تھا، یہی غرور ہے، جو ترقی کرکے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کرلیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی، اور ارشاد ہوا،

وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ، الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ، (حدید۔ ۳)	(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا، اس پر اتراؤ نہین، اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہین کرتا، جو خود کنجوس ہین، اور لوگون کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہین، اور جو (اللہ کی بات سے) منھ موڑے گا (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن وخوبی) سے مالامال ہے،

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانون کی دولت کا بھوکا ہے، کہ وہ تو غنی ہے، اور نہ اُن کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے،

خدا نے انسانون پر جو تو بر تو نعمتین اتاری ہین، اور اپنی لگاتار بخششون سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے، اُس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے، اور اسکی نعمت وبخشش کا مناسب شکر اپنے جان ومال ودل سے ادا کرے،

وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (انفال ۔ ۳)	اور اس نے تم کو پاک چیزین روزی دین تاکہ تم شکر کرو،
وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ	اور اسی نے سمندر کو تمھارے بس مین کردیا کہ تم اس سے

لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا	تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا	چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازون
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ،	کو دیکھتے ہو کہ وہ اس مین پانی کو پھاڑتے رہتے ہین
(نحل - ۲)	اور تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور تاکہ شکر کرو،
وَكَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	اور اسی طرح ہم نے ان جانورون کو تمھارے بس
(حج - ۵)	مین کر دیا کہ تم شکر کرو،
وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ	اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمھارے لئے
لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ	رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ، (قصص - ۷)	کو) اسکے فضل و کرم کی تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر کرو،

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتین ہین جنہین اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتون کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ	اللہ نے انسانون پر بڑے بڑے فضل کئے لیکن
اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ، (یونس - ٦)	ان مین سے بہت کم شکر کرتے ہین،
لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ	اور ہم نے تم کو زمین مین قوت بخشی، اور اس مین
فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ،	تمھارے لئے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے
(اعراف - ۱)	بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو،

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُر محبت غضب کا اظہار بھی فرمایا،

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ ، (عبس - ۱) مارے جائیو انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے،

شکر کے باب مین ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہین، کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا،

تو مالک کا شکر ادا ہو گیا، حالانکہ یہ صحیح نہین ہے، شکر در اصل دل کے اُس لطیف احساس کا نام ہو، جسکے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہین، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہین، اور اُس کے لئے سراپا سپاس بنتے ہین، اور کوشش کرتے ہین، کہ ہم اس کو خوش رکھ سکین، اور اسکی فرمایشون کو پورا کرتے رہین، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کرین، لیکن دل مین احسانمندی اور منّت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو، اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو، تو ہم اس محسن کی احسانمندی کے اظہار مین جھوٹے ہین، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ مین قبول نہین، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السّلام کو اپنے پے درپے احسانات سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد اُن کو خطاب کرکے فرماتا ہے،

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ، (سبا-۲) اے داؤد کے گھر والو، شکر ادا کرنے کیلئے نیک عمل کرو،

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے، اسی لئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہین،

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ مین تیرے
اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ اُس احسان کا جو تونے مجھ پر اور میرے مان باپ
صَالِحًا تَرْضٰىهُ ، (نمل-۲) پر کیا ہے، شکر کرون اور وہ نیک کام کرون جو تجھے پسند ہو

اس دعا مین بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر مین، شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو، دل مین یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گذار بندون کے حق مین جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائینگے مین اُن کے لئے اپنی نعمتون کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤنگا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لئے اپنے عمل مین سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب مین اس کو نئی نئی نعمتین اور عنایت ہوتی جاتی ہین، اسی لئے فرمایا،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اگر تم شکر ادا کروگے تو مین تم کو اور بڑھاؤن گا،

إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ، (ابراهیم-۲) اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے،

كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ، (قمر-۲) ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہین جس نے شکر کیا

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ، (آل عمران - ۱۵) اور ہم شکر کرنے والون کو جزا دینگے،

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل مین ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا مین بھلائی کے لئے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتون کی قدر جانکر اس کو مانے گا، اور اُس کے حکمون پر چلے گا اور اس کے بندون کے ساتھ شکرانہ مین بھلائی کریگا، اور خود بندون کے احسانات کے جواب مین بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کریگا، بلکہ آنحضرت صلعم نے خود آپس مین ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گذاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گذاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا مَنْ لَّا يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللهَ (ترمذی کتاب البر والصلۃ) یعنی جو انسانون کا شکر ادا نہ کریگا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کریگا اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانون کے احسانون کا شکریہ ادا نہ کریگا، تو خدا بھی اپنے احسانون کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائیگا،

خاتمہ

کتاب کی پانچوین جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات مین آنحضرت صلعم کی اُن تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب مین آپنے فرمائی ہین، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انھون نے وہم پرستیون اور غلط فہمیون کے کتنے تو برتو پردے چاک کردیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزء ہے، اسکی حقیقت کتنی واضح کردی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپکو سکھائے، اور آپنے وہ انسانون کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور ان مین کا ایک ایک آئین آپکے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین، اور مفصل اور دین و دُنیا کی مصلحتون اور فائدون پر مشتمل ہو اور آپنے اُن کے ذریعہ انسانی دلون کی کمزوریون اور روح کی بیماریون کا کس طرح علاج فرمایا ہے،

آنحضرت صلعم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہین ہو اور انھین مین سے ایک یہ ہو کہ آپکی تعلیم جسمین عبادت بھی داخل ہے عملاً صاف واضح اور متعین ہو، اور زمانۂ مابعد مین انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیون سے مبراہی، اور اُسکا اس طرح ہونا اسلیئے ضروری تھا کہ اسپر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اسلیئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہیئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی امداد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا اُنپر اپنی رحمتین اور برکتین اُتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہین ہوسکتا،

صلوات اللہ علیہ وبرکاتہٗ،

مغفرت کا طلبگار
سید سلیمان ندوی،

۱۲ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۵۴ھ

طابع وناشر
محمد اویس ارشی